مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے
پاکستان میں سالانہ دو سو روپے
دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر
بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ
بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

فہرست
مضمون نگاران معارف

۱۵۹ ویں جلد

ماہ جنوری ۱۹۹۷ء تا ماہ جون ۱۹۹۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ١٥٩

ماہ جنوری سنہ ١٩٩٧ء تا ماہ جون سنہ ١٩٩٧ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۵۹ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۷ء عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

حبِ مال اور ہوسِ زر ایک بڑا فتنہ ہے جو انسان کے دین و اخلاق ہی کو نہیں، پورے ملک و معاشرہ کو بھی تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ لیکن اب یہ بڑی اور عالمگیر بیماری بن چکا ہے اور مال و زر ہی ہر شخص کی تگ و دو کا محور ہے۔ اسی کے پیچھے دیوانہ ہو کر وہ تمام خوبیوں اور نیکیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اگر عالم میں جنگ ہے تو اسی کی، اسی کو عظمت اور بڑائی کا معیار بنا لیا گیا ہے۔ اس کے سامنے خدا ترسی، دین، علم، اخلاق، خدمتِ خلق اور اصلاح و ہدایت کے چراغ بے نور ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں تو اس دیوی کی پوجا ہی ہوتی ہے۔ اس لیے وبائے عام کی طرح پورے ملک میں بدعنوانی اور کرپشن پھیل گیا ہے جو روکے نہیں رک رہا ہے۔ ہر شخص جائز و ناجائز اور صحیح و غلط ہر طریقہ سے حصول مال میں منہمک ہے زمین و جائداد کے جھگڑوں میں جو ناختم نہیں ہوتے، خاندان کے خاندان تباہ ہو رہے ہیں اور قتل و غارتگری کا بازار ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ ہر طرف متمول لوگوں کا بول بالا ہے۔ لیکن دولت سے محروم اشخاص کسی شمار و قطار میں نہیں۔ خواہ وہ کیسے ہی خدا ترس، شریف، ذی علم اور اخلاص و دردمندی کا مجسمہ ہی کیوں نہ ہوں۔

ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور آئی یا جو لوگ بڑے اور چھوٹے سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے وہ آنکھ بند کر کے اپنا گھر بھرتے اور جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ کا عملی نمونہ پیش کرتے رہے۔ قوم و ملک کے مسائل میں سر کھپانے کی کس کو فرصت؟ ساری ذہانت و صلاحیت اور تمام قوت و قابلیت دولت سمیٹنے میں صرف ہوتی رہی۔ تاکہ ان کی کئی پشتیں ان فتوحات و غنائم سے متمتع ہوتی رہیں۔ ہوسِ زر کی تسکین کے لیے جو بدعنوانی ممکن تھی وہ بے تکلف کی گئی۔ نہ خدا کا ڈر، نہ خلق میں رسوائی کی پروا، بہتی گنگا میں سب ہی نے ڈبکی لگائی۔ نعرے سوشلزم اور سماج واد کے لگتے رہے مگر ملک کی دولت سمٹ کر انہی کے گھروں میں جمع اور چند لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتی رہی۔ غریب بیچارہ

غریب تر اور نانِ جویں کا محتاج ہو گیا۔ متوسط طبقہ گرانی کے بوجھ تلے دبتا چلا گیا۔ لیکن کار پردازانِ حکومت عیش کرتے اور مزے لوٹتے رہے۔ اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوگی کہ وزیر اعظم، کابینی وزراء، ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ممبران اور اعلیٰ حکام بدعنوانی کے مقدمات میں ملوث اور تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا کی عملی تفسیر بنے ہوئے ہیں۔

حال میں بدعنوانی کے انسداد کے قانون میں ترمیم کی جو تجویز زیر بحث آئی ہے ممکن ہے اسکے لیے قانون میں کوئی لچک ہو۔ لیکن اگر وہ منظور ہو گئی اور اس کے دائرے سے پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کو باہر کر دیا گیا تو پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے بدعنوان ممبروں کو کھلی چھوٹ مل جائے گی۔ ملک کے ان بڑے اور باوقار اداروں کی جو تصویر اب سامنے آئی ہے اس نے اس امر کو بہت ضروری بنا دیا ہے کہ بدعنوانی کے انسداد کے قانون کا اطلاق سرکاری افسروں کی طرح پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ممبروں پر بھی ہونا چاہیے۔ اگر یہ لوگ واقعی پاک دامن اور بدعنوانیوں میں ملوث نہیں ہیں تو اس قانون سے خائف کیوں ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک ریاست کی وزیر اعلیٰ کو بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کی بنا پر گرفتار کیا گیا تو سب سے زیادہ چیخ پکار ایک سوشلسٹ لیڈر اور سابق وزیر اعظم نے مچائی۔ مگر انہیں کبھی بدعنوانیوں اور بدعنوان لوگوں پر غصہ نہیں آیا۔ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مجرم کوئی بھی ہو اسے سزا ملنی ہی چاہیے۔

اس وقت ملک کے حالات کو درست کرنے اور اسے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ قانون سب کے لیے یکساں ہو۔ اور اس میں کسی طرح کی تفریق روا نہ رکھی جائے۔ مال و دولت کے متوالوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔ ان کے اندر خدا کا خوف اور خلق کی ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا جائے اور ان سے انسانیت، اخلاق اور قانون کے مسلمہ ضابطوں کی لازماً پابندی کرائی جائے ورنہ اس شجرۂ فساد کے برگ و بار پھیلتے ہی جائیں گے اور ملک و قوم کو تباہی کی لپیٹ میں لینے والی بدعنوانیوں کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اس موقع پر بے اختیار زبان پر یہ واقعہ آگیا کہ ایک مرتبہ قریش جیسے معزز خاندان کی

ایک خاتون نے چوری کی تو لوگوں کو بڑی فکر ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے سب سے محبوب اور چہیتے حضرت اسامہؓ کو سفارش کے لیے بھیجا۔ آپؐ نے فرمایا: تم حدود الٰہی کے بارے میں سفارش کررہے ہو۔ اس سے پہلے اسی لیے قومیں تباہ ہوئیں کہ وہ غریب لوگوں پر حدود جاری کرتی تھیں اور بڑے لوگوں کو چھوڑ دیتی تھیں۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ لیے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے میں ہمارے ضلع اور شہر کے مشہور قومی کارکن، کامیاب وکیل اور اچھے شاعر جناب امجد علی غزنوی کا انتقال ہوگیا۔ انھیں اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد سے مشورۂ سخن کا شرف حاصل تھا۔ ان کے گھر پر اکثر نشستیں ہوتی تھیں۔ اور انھوں نے بعض بڑے مشاعرے بھی کرائے۔ ان کا مجموعۂ کلام "صہبائے خودی" بھی زیر کتابت تھا۔ تعلیمی کاموں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے وطن محمد پور میں ایک دینی مدرسہ اور انٹر کالج ان کی یادگار ہے۔ شبلی کالج کی مجلس انتظامیہ کے ممبر اور ایک زمانے میں سینیر نائب صدر تھے۔ دارالمصنفین سے بھی تعلق تھا۔ یہاں برابر آتے تھے۔ مولانا مسعود علی ندوی کی سفارش پر کانگریس نے ۱۹۶۲ء میں انھیں ٹکٹ دیا تو صوبائی اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ مگر اب سیاست کے گرے ہوئے معیار اور خود کانگریس کے رویے سے خوش نہیں رہتے تھے۔ بڑے باغ و بہار شخص تھے۔ دوسروں کی خدمت اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرکے خوش ہوتے تھے۔ قدرت نے انھیں دردمند دل اور بے چین طبیعت بخشی تھی۔ خود کہتے ہیں ؎

اک دل درد آشنا و اک نگاہِ حق نگر
اور کیا اس کے سوا امجد سے دیوانے میں ہے

مقالات

قرآن مجید کی سائنسی اہمیت پر ایک نظر

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی۔ بنگلور۔

قرآن مجید کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اسے خالص شرعی احکام و مسائل کی کتاب سمجھ کر اس کے دوسرے علوم و مسائل نظر انداز کردیے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں بعض جدید حلقے اسے سائنسی علوم کی کتاب قرار دے کر اسکے شرعی مسائل کو اہمیت نہیں دیتے، کتاب الٰہی کے ساتھ انصاف اسی وقت ہوسکتا ہے جب افراط و تفریط سے بچ کر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ اس مضمون میں قرآن مجید کے بنیادی علوم کا تعارف کراتے ہوئے اس کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کے سلسلے میں بعض اصول و کلیات پیش کیے جائیں گے، جن سے ظاہر ہوگا کہ دینی و دنیوی حیثیت سے یہ کس قدر ضروری اور اہم علم ہے جس سے عام طور پر تغافل برتا جارہا ہے۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ اس موضوع کا صحیح تعارف علمائے متقدمین کی تحریروں اور ان کی آراء کی روشنی میں کرایا جائے۔ لیکن اصل موضوع سے پہلے قرآن مجید کا موضوع اور اس کے مباحث کی تعیین ضروری معلوم ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا موضوع اور اس کے مباحث

قرآن مجید کا موضوع زندگی کے میدان میں فکری اعتبار سے انسان کی صحیح رہنمائی ہے اور یہ رہنمائی محض شرعی مسائل تک محدود نہیں بلکہ انسان کے فکر و نظر کی اصلاح بھی اس میں شامل ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (بقرہ: ۱۸۵)

(یہ قرآن پوری) نوع انسانی کے لیے ہدایت ہے اور اس میں رہنمائی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے واضح دلائل موجود ہیں۔

اس آیت کریمہ کی رو سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید محض اہل اسلام ہی کے لیے نامۂ ہدایت نہیں بلکہ وہ عام انسانوں کے لیے بھی ایک رہبر ہے جو فکری و نظریاتی اعتبار سے ان کے لیے دعوتِ فکر فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں حسب ذیل آیات بھی مذکور ہیں:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ (یونس: ۱۰۸)

کہہ دو کہ اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق پہنچ چکا ہے۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (ابراہیم: ۱)

(اے محمد) یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے تجھ پر اتاری ہے تاکہ تو نوع انسانی کو (ضلالت کی) تاریکیوں سے (ہدایت کی) روشنی کی طرف لے آئے۔

اب سوال یہ ہے کہ فکر و نظر کے وہ کون سے گوشے یا کون سے مسائل ہیں جن میں وہ انسان کی رہنمائی کرتا ہے؟ تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ان تمام امور و مسائل میں وہ رہنمائی کرتا ہے جن سے اس نے بحث کی ہے۔ لہٰذا ہم کو قرآنی ہدایت و رہنمائی کا حال معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن مجید کے مباحث کیا ہیں اور اس نے کن کن علوم و مسائل سے تعرض کیا ہے؟ امام الہند

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کی تصریح کے مطابق قرآن مجید کے اصلی علوم پانچ ہیں۔

(۱) علم احکام یعنی حلال و حرام کا علم (۲) علم مخاصمہ یعنی غیر قوموں کے ساتھ علمی مباحثہ (۳) علم التذکیر بآلاء اللہ یعنی اللہ کی نعمتوں اور نشانیوں کے ذریعہ تذکیر (۴) اللہ کے ایام کے ذریعہ تذکیر یعنی پیغمبروں اور ان کی نافرمان قوموں کے درمیان جو معرکے ہوئے ان کے ذریعہ عبرت و موعظت (۵) اور موت نیز احوالِ آخرت کے ذریعہ تذکیر و تنبیہ۔

قرآن مجید کے تمام مباحث انہی پانچ علوم کے اندر آگئے ہیں۔ علم احکام کی تشریح و تفصیل کرنا فقیہ کی ذمہ داری ہے اور علم مباحث کی وضاحت کرنا متکلم کا کام ہے۔ (الفوز الکبیر)

پہلے دونوں علوم عقائد، عبادات اور معاملاتِ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور بقیہ تین علوم تذکیری ہیں جو انسان کو متنبہ کرنے کی غرض سے ہیں۔ علم مخاصمہ یا مجادلہ سے مراد وہ مباحثات ہیں جو گمراہ فرقوں کے ساتھ کیے گئے اور ان کے باطل عقائد کی تردید منطقی دلائل کے ساتھ کی گئی۔ انہی مباحث کے تحت عقائد و ایمانیات کی تنقیح ہوتی ہے۔ غرض قرآن مجید ان پانچوں علوم میں ہمارے لیے ہدایت نامہ اور مینارۂ نور ہے۔ اور ان میں سے کسی ایک علم کی بھی قدر و منزلت گھٹائی نہیں جا سکتی۔

یہاں موضوع بحث دوسرا اور تیسرا علم ہے۔ یعنی علم مباحثہ اور علم التذکیر بآلاء اللہ۔ جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، اس کی نشانیوں اور اس کی تخلیقات سے متعلق ہے اور جن سے جدید علوم کے سوتے پھوٹتے ہیں اور ان مباحث کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے ہے۔

گمراہ قوموں کی اصلاح علم مخاصمہ (مجادلہ و مباحثہ) میں گمراہ قوموں کے فاسد عقائد سے بحث کی جاتی ہے اور عقلی دلائل کی روشنی میں عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ قیامت کا اثبات خصوصی طور پر کیا جاتا ہے۔ تمام انبیائے کرام کی دعوت کا محور یہی تین بنیادی عقائد ہیں جو دین الٰہی کی اساس ہیں۔

دور قدیم میں اسلام کا سابقہ کفار و مشرکین سے تھا مگر دور جدید میں اس کا مقابلہ ملحدین اور مادہ پرستوں سے ہو گیا ہے جو خدا کو سرے سے مانتے ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید میں ہر دور کی ذہنیت کے مطابق علمی و عقلی دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں جدید علوم و مسائل کا تذکرہ کرنے کی اصل غرض و غایت بھی یہی ہے کہ وہ ہر دور کے عقلی تقاضوں کے مطابق اس کی ہدایت و رہنمائی کرکے گم کردہ راہ انسانوں کو راہ راست پر لائے۔

خدائی تخلیقات معرفت الٰہی کا ذریعہ "علم التذکیر بآلاء اللہ" کے تحت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں، اس کی نشانیوں اور اس کی تخلیقات کی تفصیل کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی تنقیح ہوتی ہے اور اس کی ربوبیت و الوہیت کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی تحقیق کے مطابق سب سے اعلیٰ و افضل علم اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور باقی تمام علوم ضمنی و ثانوی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی معرفت تمام علوم کی اصل اور ان کا جوہر ہے۔ چنانچہ خدا کی ذات و صفات کی معرفت کے لیے اس کے افعال کا مطالعہ ضروری ہے اور چونکہ یہ پوری کائنات اور اس کے تمام مظاہر افعال الٰہی کا روپ ہیں اس لیے مظاہر کائنات (مادی اشیاء) کے مطالعہ سے اس کی صفات عیاں ہوتی ہیں اور صفات کے مطالعہ

سے اللہ تعالیٰ کی ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ذات باری تعالیٰ کی معرفت اس کی صفات اور اس کے افعال کے مطالعہ پر موقوف ہے۔ (خلاصہ از جواہر القرآن)

امام غزالیؒ نے خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے افعال و تخلیقات سے متعلق قرآن مجید میں مذکور آیات کو "جواہر القرآن" کے نام سے موسوم کیا ہے جن کی تعداد ۷۶۳ ہے اور یہ زیادہ تر وہی آیات ہیں جو سائنسی نقطۂ نظر سے مادی اشیاء اور نظام کائنات سے متعلق ہیں جن کے مطالعہ سے خداوند قدوس کی قدرت و عظمت، اس کی ربوبیت و رحمانیت، اس کی مخلوق پروری اور اس کی بے مثال حکمت و منصوبہ بندی کا حال آشکارا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے سائنسی علوم کی روشنی میں مادی اشیاء کا تفصیلی مطالعہ دراصل "افعال الٰہی" کا مطالعہ ہے، جس کے نتیجے میں خدا کی صفات اور پھر اس کی ذات عالی تک رسائی ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ کی نظر میں اس کائنات میں خدا اور اس کے افعال کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔
(جواہر القرآن، ص ۲۶، دار احیاء العلوم، بیروت، ۱۹۸۵ء)

صفات الٰہی کی جلوہ گری غرض نظام کائنات کے تفصیلی مطالعہ سے اس عالم مادی میں خدائے تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفاتِ کاملہ کا ثبوت ملتا ہے اور قدم قدم پر اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ہر سو توحید ہی توحید نظر آتی ہے۔ گویا کہ ہم اسے بالکل سامنے کھڑا پا رہے ہیں اور شاہد حقیقی کا مشاہدہ عریاں طور پر کر رہے ہیں۔ اگر مظاہر عالم میں کارفرما حیرت انگیز نظام کا جائزہ لیا جائے تو قدم قدم پر خدائی صنعت گری اور اس کی کرشمہ سازیوں کا نظارہ ہوتا ہے، خواہ ایک ننھے سے ایٹم کا مطالعہ کریں یا نظام شمسی کا، پھول پتیوں اور رنگ برنگ گل بوٹوں کا مشاہدہ کریں یا دیمک، چیونٹی اور شہد کی مکھیوں کی اجتماعیت کا جائزہ لیں، جسم انسانی میں کارفرما حیرت خیز نظام کو دیکھیں یا انواع

حیات کے عجیب و غریب اختلافات کا مشاہدہ کریں، ہر جگہ نفاست، رعنائی اور حسن کاریگری کے مکمل نقوش نظر آئیں گے اور معلوم ہوگا کہ ان ظاہری محسوسات کے پردے میں کوئی حقیقت ثابتہ ضرور پنہاں ہے۔ ورنہ بغیر کسی انقطاع کے تسلسل کے ساتھ ان رنگا رنگیوں کا مظاہرہ ممکن نہ ہوتا۔ اسی کو تصوف کی اصطلاح میں "توحید شہودی" کہا جاتا ہے۔ یعنی ان اشیاء میں کار فرما ظاہری نقوش سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کے اندر ودیعت شدہ نظام وحدت کا مشاہدہ کیا جائے تب خدا کی صفات کاملہ کا نظارہ عینی و بصری طور پر ہو جائے گا۔ گویا کہ ہم خدا کو اپنے سامنے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

غرض علم العقائد کی رو سے خدائی صفات کی دو قسمیں ہیں: (۱) صفات ذاتی (۲) اور صفات فعلی۔ صفات ذاتی سے مراد حیات، قدرت، علم، کلام، سمع و بصر اور ارادہ ہیں۔ اور صفات فعلی سے مراد پیدا کرنا، رزق دینا، مارنا اور جلانا وغیرہ ہیں (شرح فقہ اکبر، ص ۳۳، از امام ابو منصور ماتریدی، مطبوعہ قطر)

اگر ہم موجودہ سائنسی علوم کی روشنی میں ان صفات الٰہی کی تنقیح و تطبیق کریں تو اس سے حیرت انگیز نتائج سامنے آتے ہیں جن سے عالم انسانی کی ہدایت کے لیے ایک نیا باب کھل سکتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ قرآن مجید اور سائنس کی روشنی میں باری تعالیٰ کی ان تمام صفات کو نکھار کر پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے جدید سائنسی تحقیقات نے زمین پوری طرح تیار کر دی ہے۔

بنیادی عقائد کا اثبات عقائد و ایمانیات میں قرآن حکیم سب سے زیادہ زور توحید، رسالت اور قیامت کے اثبات پر دیتا ہے اور بطور دلیل و ثبوت پوری کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظام کو پیش کرتا ہے کہ کس طرح اس عالم مادی کی ہر چیز ایک متعین

اور لگے بندھے نظام کے تحت رواں دواں ہے۔ اس میں کسی قسم کا انتشار یا بد نظمی نہیں ہے۔ اس سے ایک اعلیٰ درجے کے مدبر و منتظم کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے، جو اپنے افعال و صفات میں حد درجہ حیران کن ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ	تو خدائے رحمان کی صنعت میں کوئی
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ	خلل نہ دیکھے گا۔ تو دوبارہ نظر دوڑا
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ	کر دیکھ کیا تجھے (کہیں بھی) کوئی شگاف
إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ	نظر آتا ہے؛ تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ!
(ملک: ۳-۴)	تیری نگاہ تھکی ہوئی اور ناکام لوٹ آئے گی۔

نقاش فطرت کی یہ صنعت و کاریگری جمادات، نباتات، حیوانات اور سماوات ہر ہر عالم کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور سب ہی میں اس کی صنعت و کاریگری کے نقوش اتنے انوکھے اور عجیب و غریب ہیں کہ خود سائنس دانوں کی عقل بھی سرگرداں ہے کہ وہ ان میں ودیعت شدہ خدائی قوانین و ضوابط (قوانین ربوبیت) کا صحیح صحیح حال کس طرح ضبط تحریر میں لائیں۔

قرآن حکیم نے انسان کو نظام کائنات میں غور و خوض کر کے صحیح عقلی و منطقی نتائج اخذ کرنے کی دعوت اسی لیے دی ہے تاکہ سائنسی نقطۂ نظر سے خدا کا وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی قدرت و ربوبیت پوری طرح ثابت ہو جائے اور انسان کے لیے بغاوت و سرکشی کی مجال باقی نہ رہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید اور نظام کائنات یا قرآن مجید اور سائنس میں کوئی تعارض یا تصادم نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں

نظام کائنات سے متعلق جو مجمل آیات و اشارات موجود ہیں ان کی تفصیل جدید سائنسی تحقیقات کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ گویا کہ جدید سائنس اور اس کے اکتشافات قرآنی حقایق پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ فرق صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔ چنانچہ تحقیقات جدیدہ نے قرآن حکیم کا کوئی بھی بیان آج تک غلط ثابت نہیں کیا۔ جب کہ قدیم افکار و خیالات کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب حکمت کا برحق اور من جانب اللہ ہونا پوری طرح آشکارا ہو جاتا ہے۔

قرآن میں بعض علوم کا اجمالی تذکرہ کتاب الٰہی میں ایسے بے شمار رموز و اسرار مذکور ہیں جن کی شرح و تفصیل جدید علوم کی روشنی میں بخوبی ہو رہی ہے اور اس سے قرآن حکیم کا ایک نیا اعجاز سامنے آتا ہے اور یہ ایک ایسا وسیع علم ہے جس کی انتہا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۔ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۔ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ (انفطار: ۶-۸)

اے انسان تجھے اپنے مہربان رب سے کس چیز نے برگشتہ کر دیا؟ وہ رب جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے اعضا کو سڈول بنایا اور پھر ان میں اعتدال و توازن رکھ دیا (غرض) اس نے تجھے جس صورت میں چاہا ڈھال دیا۔

مذکورہ بالا آیت کے متعلق امام غزالی تحریر فرماتے ہیں:

"ان آیات کریمہ کو کامل طور پر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو "تشریح اعضاء کا

ماہر ہو اور وہ انسان کے اندرونی اور بیرونی اعضاء ان کی تعداد ان کی حکمت اور ان کے منافع سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو"۔ (جواہر القرآن ص ۴۶)

یہ اللہ تعالیٰ کے وہ "افعال" ہیں جو انسانی جسم کے عجائب سے تعلق رکھتے ہیں اور آج جسم انسانی کے مطالعہ کے لیے کئی علوم کی تدوین ہو چکی ہے جن میں علم الحیات (بیالوجی) علم تشریح (اناٹومی) علم افعال الاعضاء (فزیالوجی) اور طب جدید وغیرہ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ بہر حال صدیوں پہلے امام صاحب نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ آج بہت بڑی حد تک صحیح نظر آتی ہے۔ مگر اتنے سارے علوم کی تدوین کے باوجود "انسان" کو پوری طرح سمجھا نہیں جا سکا ہے۔ بلکہ وہ ربوبیت کا ایک شاہکار ہونے کے باوجود سائنسی نقطۂ نظر سے ہنوز ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب (MAN THE KNOWN) بڑی بصیرت افروز ہے۔ ان حقایق کے پیش نظر حسب ذیل آیت کریمہ کس قدر صداقت سے معمور ہے۔

وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (بنی اسرائیل: ۸۵)

اور تم کو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے "افعال" میں سے آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان دونوں کے مقررہ منازل کی پہچان بھی ہے جو اس نے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۔ (رحمان: ۵)

سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں۔

وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ

اور اس نے چاند کی منزلیں مقرر کیں

وَالْحِسَابَ۔ (یونس : ۵)	تاکہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کرسکو۔
یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ	وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے
فِی الَّیْلِ (فاطر : ۱۳)	اور دن کو رات میں۔

یہ اور اس قسم کی بعض دیگر آیات کو پیش کرتے ہوئے امام غزالی تحریر کرتے ہیں کہ چاند اور سورج کی گردش، ان کی منزلوں کا حال، ان کے کسوف و خسوف کی کیفیت اور شب و روز کے ہیر پھیر کی حقیقت وہی شخص جان سکتا ہے جو زمین اور اجرام سماوی کے احوال و کوائف سے (گہری) واقفیت رکھتا ہو اور یہ اپنی جگہ پر ایک اہم علم ہے۔

(جواہر القرآن، ص ۴۶)

قرآن مجید میں کہیں کہیں حد درجہ اجمال ہے، جس کی مکمل تشریح و تفسیر کرنا عام انسان کے بس سے باہر ہے۔ چنانچہ حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں جن میں حد درجہ اعجاز و ایجاز ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ	یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں
وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ	(خدا کے وجود اور اس کی خلاقیت
(ذاریات : ۲۰-۲۱)	و ربوبیت کی بہت سی) نشانیاں موجود
	ہیں اور خود تمہاری اپنی ہستیوں میں
	بھی کیا تم کو نظر نہیں آتا۔؟

ان دو آیات کی شرح و تفصیل میں کرۂ ارض اور انسانی اجسام میں ودیعت شدہ ان تمام سائنسی حقائق کو دلائل ربوبیت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جو ارضیات اور اس کے جغرافیائی امور، نباتیات، حیوانیات اور انسانیات (انسان کے حیاتیاتی اور نفسیاتی احوال و کوائف) سے متعلق ہوں چنانچہ ان آیات کی شرح و تفسیر میں علامہ

ابن قیم (م ۷۵۱ھ) نے صدیوں پہلے اپنی معرکۃ الآراء کتاب "التبیان فی اقسام القرآن" میں جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ پڑھنے کے لائق ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان آیات کی شرح و تفصیل میں بلا مبالغہ اگر پورے سائنسی لٹریچر کو پیش کیا جائے تو بھی ان کی مکمل تفسیر نہیں ہوسکے گی۔ یہی مطلب ہے حسب ذیل آیت کریمہ کا:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ	کہہ دو کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے
رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ	کے لیے سمندر بھی سیاہی بن جائے
كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ	تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے
مَدَدًا۔ (کہف : ۱۰۹)	پہلے سمندر ہی ختم ہوجائے، اگرچہ
	اس کی مدد کے لیے ہم اس جیسا ایک
	اور سمندر لے آئیں۔

قرآن مجید ایک بحر زخار

اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں مختلف علوم و فنون کے بارے میں جو اجمالی اشارات مذکور ہیں ان کو علی وجہ البصیرت سمجھنے کے لیے علوم و فنون کے سمندروں کی غواصی ضروری ہے۔ گویا کہ قرآنی اشارات مختلف علوم و فنون کے عناوین کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں علوم و فنون کی روح کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔ یعنی کتاب الٰہی میں نظام کائنات سے متعلق ایسے اسرار و حقائق مذکور ہیں جن تک انسان کی رسائی مسلسل تحقیق اور غور و خوض کے ذریعہ صدیوں بعد ہوسکتی ہے۔ مگر کمال یہ ہے کہ افکار و نظریات کی تبدیلیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ ہر نئے اکتشاف کی بدولت کتاب الٰہی کا چہرہ مزید روشن ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جدید سے جدید تر کسی بھی سائنسی تحقیق نے قرآن عظیم کا کوئی بھی بیان آج تک

غلط ثابت نہیں کیا۔ بلکہ کلام الٰہی کے اسرار دن بدن کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ کیا یہ اس کتاب کے برحق اور من جانب اللہ ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟ اس سے بڑا علمی ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

دو قسم کے حقایق قرآن میں دو قسم کے سائنسی حقایق بیان کیے گئے ہیں۔ جن کا تعلق مادی مظاہر سے ہے۔ ایک تو وہی مذکورہ بالا قسم کے اجمالی بیانات اور دوسرے اس مادی کائنات اور اس کی مشنری سے متعلق بعض راز کی باتیں یا "اسرار ربوبیت" جو مجاز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں، جن کا صحیح مفہوم سائنسی علوم کی ترقی کے بعد واضح ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نباتات بھی جوڑے جوڑے (نر و مادہ کی شکل میں) ہوتے ہیں، یہ حقیقت قرآن عظیم میں صراحتاً مذکور ہے۔ مگر اس انکشاف کے ظاہر ہونے تک اس کو مجازی معنی میں لیا گیا۔ چنانچہ لفظ "زوج" کے معنی میاں یا بیوی نیز نر یا مادہ کے بھی آتے ہیں اور مجازاً قسم یا صنف کے بھی۔ قرآن مجید میں صراحتاً کہا گیا ہے:

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ۔ (یٰسین: ۳۶)

پاک ہے وہ ذات برتر جس نے تمام جوڑے بنائے، زمین سے اگنے والی چیزوں میں بھی اور خود انسانی ہستیوں میں بھی، نیز ان چیزوں میں بھی جن کو یہ لوگ نہیں جانتے۔

پیڑ پودوں میں نر و مادہ کا پایا جانا ایک جدید ترین حقیقت ہے جس کا انکشاف قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے ہی کر کے اپنے کلام برحق ہونے کا ثبوت پیش کر دیا ہے لیکن اس آیت کریمہ میں ایک ایسا اصول اور کلیہ بھی بیان کیا گیا ہے جو خود سائنس کے لیے

ایک دعوت فکر ہے۔ یعنی اس کائنات مادی میں حیوانات و نباتات کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو جوڑوں (ازواج) کی شکل میں ہیں، مگر انسان انہیں نہیں جانتا۔ قرآن مجید کا یہ کلیہ کبھی ٹوٹ نہیں سکے گا۔ خواہ انسان حیوانات و نباتات کے علاوہ بھی کچھ مزید اشیا میں جوڑوں کی موجودگی کا پتہ لگا لے۔ یہ ربانی کلمات صداقت سے معمور اور شک و شبہہ سے بالاتر ہیں۔

قرآن تمام علوم کا جامع کتاب الٰہی ایک جامع صحیفہ ہے۔ یہ ازل سے ابد تک کے تمام علوم و معارف کا جامع اور رازہائے کائنات کا امین ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ۔ (انعام: ۳۸)

ہم نے اس کتاب میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ۔ (نحل: ۸۹)

ہم نے آپ پر ایسی کتاب اتار دی ہے۔ جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے۔

نیز ایک حدیث کے مطابق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ، وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ: قرآن میں تم سے پہلے کی خبریں بھی ہیں اور تمہارے بعد کی بھی اور اس میں تمہارے آپس کے معاملات کے درمیان فیصلہ کرنے والی چیز بھی موجود ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ "جسے علم کی تلاش ہو وہ قرآن کو لازم پکڑے۔ کیونکہ اس میں اگلے اور پچھلے تمام لوگوں کی خبریں موجود ہیں۔" (سنن سعید بن منصور، بحوالہ الاتقان)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) تحریر کرتے ہیں کہ کتاب اللہ میں ہر چیز کا

تذکرہ موجود ہے۔ چنانچہ مختلف علوم کا کوئی باب یا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو اس میں مذکور نہ ہو۔ اس میں مخلوقات کے عجائب اور زمین و آسمان کے غرائب وغیرہ ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن، ۴/۳۳)

امام غزالیؒ نے پانچویں صدیوں ہی میں ایک ایسا فکر انگیز خیال ظاہر کیا ہے جو ان کی علمی بصیرت اور ژرف نگاہی پر دلالت کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"امکانی طور پر ایسے بہت سے علوم ہو سکتے ہیں جو ابھی تک وجود میں نہیں آسکے ہیں مگر ان تک انسان کے پہنچنے کا امکان ہے اور ایسے بھی علوم ہیں جن کا انسانی عقل ادراک نہیں کر سکتی۔ مگر قرآن مجید میں ان تمام علوم کا تذکرہ پایا جاتا ہے اور وہ ایک بحر بے کراں ہے، جس کے ساحل کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ وہ معرفت الٰہی اور اسکے "افعال" کا ایک سمندر ہے۔ (خلاصہ از جواہر القرآن، ص ۴۴-۴۵)

ربوبیت کے جلوے | قرآن عظیم نوع انسانی کو پوری طرح جھنجھوڑتے ہوئے کہتا ہے کہ زمین اور اجرام سماوی کی تخلیق میں غور کرو، دن رات کے ہیر پھیر کو دیکھو، ہوا اور بارش کے نظام کا جائزہ لو، حیوانات و نباتات کے عجائب و غرائب کا مشاہدہ کرو، آفتاب و ماہتاب کی حرکات کو غور سے دیکھو۔ غرض دنیا کی ہر چیز اور ہر مظہر فطرت کا باریک بینی کے ساتھ مطالعہ کرو تو ان کی مشنری میں تم کو انتہا درجے کی تنظیم، منصوبہ بندی، وحدت، حسن کاری، صنعت گری اور فنی مہارت کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ چنانچہ ایک خلاق، منصوبہ ساز اور ایک عظیم ترین مدبر ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر ان نفیس ترین ضوابط کی توجیہ ممکن نہیں ہو سکتی۔ دراصل یہ سب ربوبیت کے وہ جلوے ہیں جن سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے، سوائے غافل انسانوں کے۔

کائنات مادی افعال الٰہی کی آماجگاہ | خلاصۂ بحث یہ ہے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام مظاہر "افعال الٰہی" کا مظہر ہیں، جن کے مطالعہ و مشاہدہ سے صفات الٰہی کا جلوہ نظر آتا ہے اور صفات الٰہی کے جائزہ سے ذات باری تعالیٰ کا نظارہ ہوتا ہے، جو ربوبیت و الوہیت کے بھیس میں جلوہ گر اور اس عالم مادی پر حکمرانی کر رہی ہے اور جس کے حکم کے بغیر اس عالم رنگ و بو کا ایک ذرہ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہو سکتا۔ یہ پوری کائنات افعال الٰہی کا مجموعہ ہے جو عالم انسانی کو یہ دعوت فکر دے رہی ہے کہ اس کے حیرت انگیز نظام کا مطالعہ کر کے اس کے خالق و مربی کو پہچانا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کائنات مادی کے ایک ذرہ (ایٹم) کا دل بھی اگر چیر کر دیکھا جائے تو اس میں اسباق و بصائر کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آئے گا جو وجود باری اور اس کی بے مثال قدرت و ربوبیت پر دلالت کرنے والا ہوگا۔ چنانچہ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

للہ فی کل تحریکۃٍ ‏ ‏ ‏ وفی کل تسکینۃٍ لہ شاھدٌ
وفی کل شیءٍ لہ آیۃٌ ‏ ‏ ‏ تدل علی انہ واحدٌ

یعنی ہر (چیز میں موجود) حرکت و سکون اللہ کے وجود پہ گواہ ہے اور دنیا کی ہر چیز میں اس کی ایک نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ واحد ہے۔

شرک کا نیا روپ | کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ یعنی وہی قدیم احوال و کوائف بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، خواہ زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے۔ چیز ایک ہوتی ہے مگر اس کے رنگ و روپ مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج شرک بھی ہمارے سامنے ایک نئے انداز میں جلوہ گر نظر آرہا ہے، جو مادیت کا چوغہ زیب تن کیے ہوئے ہے چنانچہ قدیم مشرکین اور جدید منکرین (مادہ پرستوں)

کی ایک مشترکہ خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ مشرکین خدائی صفات کو دوسری ہستیوں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ جب کہ انہی خدائی صفات کو موجودہ ملحدین و مادہ پرست "مادہ" (MATTER) کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مادہ اپنے وجود کی آپ ہی علت ہے اور یہ وہ رحم مادر ہے جس سے ساری چیزیں خود بخود ظہور میں آرہی ہیں۔ وہ بغیر خداؤں کی مداخلت کے اپنے آپ ہی سب کچھ کرلیتا ہے۔ اس طرح انہوں نے خدا کی جگہ مادہ کو بٹھا دیا ہے اور اس لحاظ سے دونوں ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ مشرکین خدا کی خدائی میں دوسرے معبودوں کو شریک کرنے کے باوجود ایک رب الارباب یا سب سے بڑے خدا کا وجود تسلیم کرتے ہیں۔ جب کہ مادہ پرستوں کے نزدیک مادہ ہی واحد اور سب سے بڑا "خدا" ہے۔

اس اعتبار سے توحید اور شرک کا معرکہ آج بھی درپیش ہے لہذا اس نئے شرک سے پنجہ آزمائی کے لیے ہمیں خود کو سائنسی ہتھیاروں سے مسلح کرنا پڑے گا۔ ورنہ یہ بھوت اترنے والا نہیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے تحت قرآن حکیم نے مظاہر کائنات اور ان کے نظام کا ذکر کرکے نہ صرف اپنا داعیانہ وہادیانہ کردار ادا کیا ہے بلکہ اہل اسلام کے ذمہ یہ فریضہ بھی عائد کیا ہے کہ وہ قرآنی مقاصد کے مطابق جدید سے جدید تر تمام علوم میں کمال حاصل کرکے نوع انسانی کو راہ راست پر لائیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

فقیہ و متکلم کا درجہ

علم احکام کی تنقیح کرنا فقیہ کا کام ہے اور علم مجادلہ (مباحثہ) کی توضیح متکلم کا ذمہ ہے۔ چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ:

"فقیہ اور متکلم کا درجہ قریب قریب یکساں ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک فقیہ کی ضرورت عموماً زیادہ ہوتی ہے۔ جبکہ ایک متکلم کی ضرورت شدید ہوجاتی ہے اور دینی مصلحتوں کے لحاظ سے ان دونوں کی ضرورت یکساں ہے۔ فقیہ کی حاجت کھانے پینے اور شادی بیاہ وغیرہ کے خصوصی احکام کے سلسلے میں اور متکلم کی ضرورت گمراہ اور بدعتی لوگوں کے ضرر سے بچنے اور ان کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنے کی غرض سے رہتی ہے تاکہ اہل اسلام کو ان کے شر سے محفوظ رکھا جاسکے۔" (جواہر القرآن، ص ۴۰)

قرآن فطرت و شریعت کا جامع

غرض قرآن حکیم محض شرعی مسائل ہی کی کتاب نہیں بلکہ وہ تکوینی (طبیعی) امور و مسائل میں بھی ہماری مکمل رہنمائی کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ فطرت و شریعت کا ایسا جامع دستور العمل ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے پورا انسانی لٹریچر عاجز ہے۔ لہذا ہمیں اس معاملے میں مکمل توازن سے کام لیتے ہوئے ان دونوں کے ساتھ صحیح انصاف کرنا چاہیے ورنہ عالم انسانی کی رہنمائی نہیں ہوسکتی۔ اہل اسلام کو "خیر امت" اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ اقوام عالم کی صحیح قیادت کرکے انہیں راہ راست پر لائیں۔ مگر چونکہ آج اقوام عالم جدید علوم کے نشہ میں سرشار ہیں، اس لیے ان علوم میں کمال حاصل کرکے کھرے اور کھوٹے کی نشاندہی کیے بغیر ان کو راہ راست پر لانا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ لہذا اہل اسلام اٹھیں اور قرآن حکیم کی رہنمائی میں ان کا یہ سب سے بڑا فریضہ ادا کرکے اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہوں۔

ایک نئے فکری انقلاب کی ضرورت

موجودہ دور میں اہل اسلام کا فریضہ یہ ہے کہ وہ جدید سائنسی علوم کا تحقیقی نقطۂ نظر سے صحیح مطالعہ کرکے ان میں سرایت کردہ الحاد و مادیت کے جراثیم باہر نکالیں اور ان تمام علوم کی خدا پرستانہ طور پر تشریح و توجیہ کرکے

خداوند کریم کی ربوبیت ثابت کریں۔ ورنہ کلمہ الٰہی کا بول بالا نہیں ہو سکتا اور یہ عالم اپنی تہ بہ تہ تاریکیوں کے غار سے کبھی باہر نہیں آسکتا۔ واضح رہے اس کائنات میں کارفرما حیرت انگیز نظام کے مشاہدہ سے خود سائنس داں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہیں اور بہت سے سائنس داں اس کی مادہ پرستانہ تشریح و توجیہ سے مطمئن نہیں ہیں مگر خدا پرستانہ نقطہ نظر سے مطمئن کرنے والی کوئی متبادل چیز ان کے سامنے نہیں آسکی ہے۔ اس لیے وہ بھی حیران و سرگرداں ہیں۔ لہٰذا یہ فریضہ قرآن حکیم کی روشنی میں صرف اور صرف امت مسلمہ ہی انجام دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے منصب علمی کا صحیح معنیٰ میں احساس کرلے اور پھر اس میدان میں علمی اقدام کے لیے تیار ہو جائے۔ جب تک یہ نہیں ہوگا عالم انسانی کی فکری و نظریاتی حیثیت سے اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ عالم انسانی میں ایک فکری انقلاب لانا خود امت مسلمہ کے فکری انقلاب پر موقوف ہے اور اس مقصد کے لیے ایک خصوصی جماعت تیار کرنا مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے۔ ورنہ وہ خدا کے نزدیک مجرم ہوں گے۔ اس وقت ضرورت ایک بہت بڑے علمی جہاد کی ہے اور اہل اسلام کو اس علمی جہاد کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا جب ذیل آیت کریمہ کے مطابق اہل اسلام کا منصب ہی نوع انسانی کی صحیح رہنمائی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران: ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو نوع انسانی کے لیے برپا کی گئی ہے (اور تمہارا منصب یہ ہے کہ) تم معروف (عقلی و شرعی اعتبار سے درست بات) کا حکم کرتے ہو اور منکر (عقلی و شرعی

اعتبار سے غلط بات) سے روکتے ہو۔

قرآن عظیم پوری نوع انسانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ۔ (ابراہیم: ۵۲)

یہ قرآن تمام لوگوں کے لیے ایک (واضح) پیغام ہے تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ ڈرایا جائے اور وہ جان لیں کہ (اس کائنات میں) وہی ایک معبود ہے اور ارباب عقل متنبہ ہو سکیں۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔ (زمر: ۲۷)

اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال بیان کردی ہے تاکہ وہ چونک سکیں۔

شاہان مغلیہ اور سلاطین عثمانی کے عہد میں

حج کے راستوں کی حفاظت کا مسئلہ

از پروفیسر نعیم الرحمن فاروقی۔ آکسفورڈ

مترجم جناب محمد اکرم ندوی، آکسفورڈ

(۲)

اورنگ زیب مکہ مکرمہ کے بحری راستہ کو تحفظ فراہم کرنے پر مصر نظر آتا ہے، سورت کے گورنر کے نام متعدد شاہی فرامین جاری کیے گئے، جن میں اسے ہدایت کی گئی کہ اراضی مقدسہ کے مسافرین اور حجاج کرام کے تحفظ کی پوری کوشش کرے[1] میر آتش (توپ خانہ کے سربراہ) کو ہدایت کی گئی تھی کہ اسلحہ جات کے شعبہ کے فرنگیوں سے دریافت کرے کہ کس طرح قزاقوں کو سزا دی جائے اور سمندری راستوں کو مقامات مقدسہ کے زائرین اور تجار کے لیے کس طرح کھلا رکھا جائے؟ دوستی اور مصالحت سے؟ یا طاقت اور جنگ سے[2]۔ اورنگ زیب نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ قزاقوں کو سزا دینے کے لیے ایک

[1] KALIMAT-I-TAYYIBAT, P. 31, JADU NATH SARKAR, HISTORY OF AURANGZIB (NEW DE-HI, 1972, V. 265, SARKAR, THE AFFAIRS OF THE ENGLISH FACTORY AT SURAT 1694-1700, PIHRC,

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵ پر)

طاقتور بحری بیڑہ قائم کیا جائے۔ لیکن منوچی لکھتا ہے کہ تجربہ کار ملاحوں کی کمی نے اورنگ زیب کو اس منصوبہ کے ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا[1]۔ ایک مغل بحری بیڑہ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ۱۶۷۰ء میں ایک ماہر بحری کپتان سیدی یاقوت خاں کو شاہی خدمت میں شامل کر لیا گیا، سیدی کو ہدایت کی گئی کہ سمندری راستوں پر حجاج کرام اور تجارتی جہازوں کی حفاظت کرے جس کے لیے تین لاکھ روپے سالانہ معاوضہ طے کیا گیا[2]، سیدی کا بحری بیڑہ اگرچہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴) V, (1923) 10, S. H. ASKARI, MUGHAL NAVAL WE-

KALIMAT-I-TAYYIBAT, P. 53, ASKARI MUGAL- [2] -AKNESS, 14

MANUCCI, STORIO DO MOGOR, ii. [1] -NANAL WEAKNESS, P.8

40.2 [2] حبشہ کا باشندہ سیدی یاقوت خاں کوکن کے گورنر فتح خاں کا غلام تھا، خوافی خاں کے بیان کے مطابق جب فتح خاں نے جنجیرہ کا قلعہ شیواجی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تو سیدی یاقوت اور دوسرے دو غلاموں سنبل اور خیریت نے اس (فتح خاں) کی مخالفت کی اور اسے مقید کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور سنبل کو اپنا قائد منتخب کر کے مغلوں کی بالادستی قبول کر لی، سنبل کی وفات کے بعد یاقوت قلعہ کا مالک ہو گیا، اس نے دندا راجپوری کو شیواجی سے حاصل کیا اور سات دوسرے مراٹھا قلعوں پر قبضہ کر لیا، ان کامیابیوں کی وجہ سے اورنگ زیب نے یاقوت کے منصب میں اضافہ کر دیا، اسے خاں کا لقب عطا کیا اور سرکاری طور پر اسے دندا راجپوری کا مغل فوجدار بنایا، اسے مکہ مکرمہ کے بحری راستہ کی نگرانی کی ذمہ داری بھی سونپی گئی، مرآۃ احمدی کے بیان کے مطابق اس خدمت کے صلہ میں اسے ایک لاکھ پچاس ہزار روپے سالانہ ملتے تھے، انگلش فیکٹری ریکارڈز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم چار لاکھ سالانہ تھی، سیدی یاقوت خاں کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: منتخب اللباب ۲/۳-۲-۲۸، ۲۵۳-۴۰۰-۵۱۳، ۵۔ علی احمد خاں: مرآۃ احمدی

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶ پر)

بڑی کشتیوں اور بھاری ہتھیاروں سے لیس تھا لیکن یوروپین قزاقوں کے جہازوں سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا،[1] نتیجتاً وہ ہندوستانی جہازوں اور حجاج کا دفاع نہ کرسکا۔

۱۶۹۵ء میں سمندری راستوں کی قزاقی پر قابو پانے کے لیے اورنگزیب نے یوروپین تجارتی کمپنیوں کو مجبور کیا کہ پابندی کے ساتھ ہر سال حجاج کرام کی سواریوں کو جنگی جہازوں کی مرافقت فراہم کریں[2] اور چار سال بعد اس نے ان کو ایک مچلکہ پر دستخط کرنے پر مجبور کیا، جس میں انھوں نے عہد کیا کہ قزاقی کا قلع قمع کردیں گے اور جہازوں کے تاراج ہونے کی حالت میں مالکان کو معاوضہ ادا کریں گے، معاہدہ کے مطابق ڈچ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵) (بڑودہ، ۱۹۲۷ء) ۸-۱/۲۷۳-۴، نیز ملاحظہ ہو: ARNOLD WRIGHT, ANNESLEY OF SURAT AND HIS TIMES (LONDON, 1918), PP. 70, 124-38, K.M. PANIKKAR, INDIA AND THE INDIAN OCEAN: AN ESSAY ON THE INFLUENCE OF SEA POWER ON INDIAN HISTORY (LONDON, 1945) P. 58, COMMISSARIAT, GUJARAT, iii. 395-99, ASHIN DAS GUPTA, TRADE, AND POLITICS IN 18TH CENTURY INDIA, ISLAM AND THE TRADE OF ASIA, ED. D.S. RICHARDS (OXFORD, 1970) P. 192

[1] WRIGHT, ANNESLEY, P. 130

[2] ۱۶۹۵ء میں شاہی حج کے جہاز گنج سوائی پر انگریز قزاقوں کی غارت گری کے جواب میں یہ اقدام کیا گیا، خوافی خاں کے بیان کے مطابق جہاز جدہ سے باون لاکھ روپیوں کی قیمت کے سونے اور چاندی لیکر لوٹ رہا تھا، خزانہ لوٹ لیا گیا، حاجیوں کی توہین کی گئی اور خواتین کی بے حرمتی کی گئی، منتخب اللباب ۲/۴۲۱-۴، نیز ملاحظہ ہو: WRIGHT, ANNESLEY, PP. 162-89, SARKAR, HISTORY, V. 261-3, COMMISSARIAT, GUJARAT, iii. 448-9.

حجاج کرام کے ساتھ جدہ جاتے اور بحر احمر میں داخلہ کی حفاظت کرتے، انگریز جنوبی ساحل کے ذمہ دار تھے اور فرانسیسیوں کو خلیج فارس کی نگرانی کرنی تھی[1] لیکن یہ اقدامات بھی تقریباً غیر موثر ثابت ہوئے، ۱۷۰۱ء اور ۱۷۰۳ء میں متعدد مغل جہازوں پر حملے ہوئے اور ان کو لوٹ لیا گیا۔

کرایہ کے جہازوں اور اہل یورپ کے تعاون سے مکہ مکرمہ کے سمندری راستہ کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اورنگزیب نے مسقط کے عرب قزاقوں کی طرف رخ کیا جو بحری طاقت میں مشہور تھے۔ سورت کے گورنر کو احکام دیے گئے کہ جنگی سواریوں کے حصول اور ان کے تعاون سے انگریز اور ڈچ قزاقوں کو سزا دینے کے لیے مسقط والوں سے معاہدہ کرلے، گورنر کو مسقط والوں سے یہ بھی درخواست کرنی تھی کہ ہندوستانی حجاج کو بحفاظت ان کی منزل پر پہونچادیں،[2] ساتھ ہی اورنگزیب کے پوتے ملتان کے گورنر معزالدین کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے کسی معتمد کے ہاتھ قیمتی تحائف

---

[1] ۱۶۹۸ء میں انگریز اور ڈچ قزاقوں کی سرگرمیوں کے جواب میں یہ تادیبی کارروائی کی گئی تھی۔ SARKAR, AURANGZIB, V. 267-8, WRIGHT ANNESLEY, PP. 190-207, MAHARASHTRA STATE ARCHIVES, PRESIDENCY RECORDS, SECRETRIAT OUTWARD LETTER BOOK, NO. 6, 1697-9, PP. 229-30, ASHIN DAS GUPTA, GUJARATI MERCHANTS AND THE RED SEA TRADE, THE AGE OF PARTNERSHIP. EUROPEANS IN ASIA BEFORE DOMINIONS. ED BLAIR B. KING AND M.N (HONOLULU, 1979) PP. 124-31

[2] احکام عالمگیری، ص ۷۔

مسقط کے شیخ کے پاس بھیجے اور اسے یورپ کے قزاقوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کرے جس کے بدلہ میں مغل ایران کے خلاف اس کی مدد کریں گے، مسقط کے حاکم کو اس پر آمادہ کرے کہ دربار عالی کی طرف توجہ کرے، اسے اس کا اشارہ دیا جائے کہ ایرانی بادشاہ مسقط کی جانب ایک فوج روانہ کرنا چاہتا ہے اور اسے بہترین انداز سے اس کی یقین دہانی کرائی جائے کہ اس سلسلہ میں اسے ہندوستان سے مدد اور تعاون حاصل ہو سکتا ہے۔[1] آخر میں اورنگزیب کے فرزند شہزادہ محمد اعظم والی گجرات کو بتایا گیا کہ اورنگزیب کو اراضی مقدسہ کا رخ کرنے والے جہازوں کی حفاظت کے مشترکہ مقصد کی وجہ سے مسقط کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی امید ہے۔[2]

بظاہر معلوم نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب نے حاکم مسقط کے ساتھ باقاعدہ کوئی اتحاد قائم کر لیا، کسی مغل واقعہ نگار نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، منتخب اللباب کا مصنف خوافی خاں بھی جس نے بحر ہند میں انگریز قزاقوں کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے اس اتحاد کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا، غالباً مجوزہ انضمام ایک خیال رہا جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، بہرحال داخلی مسائل کے مقابلہ کے لیے بیرونی امداد کی خواہش وطلب یوروپ کے بحری تفوق کے سامنے مغلوں کی بے بسی کو ظاہر کرتی ہے، ساتھ ہی اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اورنگزیب ہندوستان سے حج کے راستہ کے تحفظ کے لیے کس قدر متفکر تھا، اس نے حجاج کرام کو محفوظ رکھنے کی مکمل کوشش کی، لیکن اس کی ساری جدوجہد رائگاں گئی۔ بحر ہند کی نگرانی کے لیے جنگی بیڑہ کی کمی سے بے بس ہو کر یوروپ کی قزاقی کے سامنے اس نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ابھی کچھ اور مدت تک مکہ مکرمہ کا

---

[1] حوالہ سابق، ص، [2] کلمات طیبات، ص ۹۵، ۱۳۹-۴۰، مرآۃ احمدی ۱/۳۵۳-۵۴۔

سفر ان خطرات کے باوجود کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔

اورنگزیب کے کمزور جانشین سمندر میں اہل یوروپ پر قابو پانے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے، سلطنت مغلیہ کے زوال، گجرات میں مراٹھوں کے حملہ اور سورت کے حصول کے لیے مغل امراء کی داخلی کشیدگی سے حوصلہ پا کر یوروپ کی کمپنیوں نے کھلے طور پر سورت کے سوداگروں پر اپنی بہادری دکھانا شروع کر دی اور حج کے راستہ پر پابندی عائد کر دیں۔ ۱۷۰۵ء کے بعد ڈچ نے حج کے جہازوں کو لے جانا بند کر دیا۔[1] ۱۷۳۴ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے جنگی جہازوں نے سورت کا محاصرہ کر لیا، تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیا گیا اور حج کا راستہ بند رکھا گیا یہاں تک کہ طویل گفت وشنید کے بعد برطانوی بیڑہ کے کپتان نے حج کے صرف ایک جہاز کو روانہ ہونے کی اجازت دی۔[2]

اس کے برخلاف عثمانیوں کو اپنی رعایا کے لیے مکہ مکرمہ کے راستوں کو آزاد رکھنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ سلطنت عثمانیہ کو مکہ مکرمہ سے جوڑنے والے حج کے تمام راستے عثمانیوں کے زیر اقتدار تھے۔ حج کے قافلے جو عثمانی سلطان کی نگرانی میں منظم کیے جاتے تھے مکہ مکرمہ کا سفر کسی رکاوٹ اور ظلم وتشدد کے خوف کے بغیر کرتے تھے عثمانی سلاطین کی خادم الحرمین الشریفین کی حیثیت جس کی حفاظت وہ پورے جوش سے کرتے تھے اور جس کا فخریہ اعلان کرتے اور عالم اسلام کی خلافت کے ان کے دعوے کے پیش نظر

---

[1] MSA, SURAT FACTORY DIARY, NO. 3, 1701-4, P. 129a
سورت کے زوال اور گجرات میں مغل انتظامیہ کے خاتمہ کے لیے ملاحظہ ہو: مرآۃ احمدی ۱/۳۹۲-۴۰۱،
نیز ملاحظہ: ASHIN DAS GUPTA, TRADE, PP. 181-214 _

[2] COMMISSARIAT, GUJARAT, iii. 558-9.

مسلمانوں کے سفر حج کے لیے سہولیات فراہم کرنا ان کا فرض تھا۔ یہ مختلف حیثیتوں سے بہت ہی اہم کام تھا، موجود شہادتیں بتاتی ہیں کہ عثمانی سلاطین نے ان ذمہ داریوں کو کم سے کم سولھویں صدی کی حد تک برضا و رغبت پورا کیا، پرتگالیوں اور ایرانیوں کے ساتھ ان کی کشیدگیاں اس کا کافی ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

عثمانی سلاطین ان خطروں سے بخوبی واقف تھے جو مشرق سے حج کے راستہ میں پرتگالیوں کے ہاتھوں پیش آتے تھے، بحر احمر میں پرتگالیوں کی موجودگی کے اثرات اور مقدس شہروں کے خلاف ان کے منصوبوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں سلطان بایزید دوم (۱۴۸۱-۱۵۱۲) نے مصر کے مملوک سلطان کے ساتھ تعاون کیا تھا[1] اور ۱۵۱۷ء کے بعد عثمانی سلاطین نے خصوصی طور پر خود کو اراضی مقدس کے دفاع کے لیے وقف کر دیا تھا، پرتگالیوں کو بحر احمر سے دور رکھنا ان کے لیے بڑی اہم بات تھی۔ اینڈریو سی۔ ہس لکھتا ہے: "اپنی غازیانہ روایت سے سچی وابستگی کی وجہ سے عثمانی خاندان ان حصار بند مسلم ریاستوں اور نہر سوئز کے مشرق میں واقع تجارتی مراکز کے مسلم ہیرو بنے ہوئے تھے جن پر پرتگالی امپیریلزم کا انحصار تھا[2]، قدیم

[1] MICHEL M. MAZZOUI, GLOBAL POLICIES OF SULTAN SELIM, 1512-20, ESSAYS ON ISLAMIC CIVILIZATION, ED, DONALD P. LITTLE (LEIDEN, 1976), P. 235, STRIPLING, TURKS AND ARABS, P. 32.
[2] ANDREW C. HESS, THE OTTOMAN SEABORNE EMPIRE 1453-1525, AMERICAN HISTORICAL REVIEW, LXXV (1970), 1, 911-

تجارتی راستوں کی پرتگالیوں کی حصار بندی کے نتیجہ میں ہندوستانی تجارت سے آمدنی کے نقصان اور نتیجتاً مصر، مشرقی بحر متوسط کی ریاستوں اور نیز عثمانی سلطنت میں معاشی بحران عثمانیوں کے لیے اضافی محرک تھے کہ پرتگالیوں کو بحر ہند سے باہر نکال دیں"۔ ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ سلطان سلیم اول (۱۵۱۲-۱۵۲۰ء) کی خط و کتابت شہادت دیتی ہے کہ عثمانی مصر تھے کہ بحر احمر اور بحر ہند میں پرتگالیوں کی بحری برتری کا خاتمہ کر دیں ۱۵۱۹ء میں سلطان نے پچاس جہازوں کا ایک بیڑہ تیار کرنے کا حکم دیا جسے پرتگالی دخل اندازوں کے خلاف متعین کیا جانا تھا[2] لیکن اپنے منصوبہ کی تکمیل تک وہ زندہ نہ رہا، ۱۵۲۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سلیم کا جانشین سلیمان اول (۱۵۲۰-۱۵۶۶ء) بھی اسی طرح مسلمانوں کا غیرت مند اور پرجوش محافظ تھا، ۱۵۲۵ء میں بحر احمر کے عثمانی امیر البحر سلمان رئیس نے ایک رپورٹ

[1] MAZZOUI, GLOBAL POLICIES, PP. 230-32
[2] TOPKAPI SARAI - MUSEUM ARCHIVES, ISTANBUL, E 8331, LETTER OF THE GOVERNER OF JEDDA TO SULTAN MUZAFFAR II OF GUJARAT (1519) M. YAKUB MUGHAL, THE BEGINNING OF THE OTTOMAN DOMINATION IN THE RED SEA: THE WAY TO INDIA, SIND UNIVERSITY ARTS AND RESEARCH JOURNAL (1970) PP. 57-8, بحر ہند میں عثمانی سیاست کے لیے ملاحظہ ہو M. Y. MUGHAL, KANUNI DEVRI OSMANLILARIN HINT OKYANUSU POLITIKASI VE OSMANLI-HINT MUSULMANLARI MUNASEBETLERI (ISTANBUL, 1974,

پیش کی جس میں بحرِ احمر اور بحرِ ہند میں پرتگالیوں اور عثمانیوں کی طاقت کی طرف اشارہ تھا، اس میں سلطان سے درخواست کی گئی تھی کہ ان سمندروں میں عثمانیوں کی کارروائیوں کو استحکام بخشا جائے، سلطان سلیمان اول کو یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ایک عثمانی بحری بیڑہ کے ذریعہ ہندوستان کی ساری بندرگاہوں اور مراکز پر قبضہ رکھنا ممکن ہوگا جو کہ اس وقت کافروں کے قبضہ میں ہیں[۱]، سلطان کو ہندوستانی حکمرانوں کی جانب سے بھی پرتگالیوں کے خلاف مکرر درخواستیں موصول ہوئیں، غالباً ان درخواستوں کے جواب میں ۱۵۳۶ء میں سلیمان نے ایک طاقتور بیڑہ ہندوستان روانہ کیا، جس کی قیادت مصر کا گورنر خادم سلیمان پاشا کر رہا تھا، جسے ہدایت کی گئی تھی کہ پرتگالیوں کی مقبوضہ ہندوستانی بندرگاہوں پر قبضہ کر لے، سمندروں سے پرتگالی طاقت کی جڑوں کو نکال پھینکے، اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا راستہ کھول دے[۲] یہ مہم ناکام رہی اور ان مقاصد میں سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوا[۳]

---

۱ SALIH OZBARAN, A TURKISH REPORT ON THE RED SEA AND
THE PORTUGUESEN THE INDIAN OCEAN (1525) ARABIAN
۳ PANIKKAR, INDIA, P.46 ۲ STUDIES iv (1977), 82.3
اس مہم کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: IBRAHIM PECHEVI PECEVI TARIHI
ED. MURAT URAZ (ISTANBUL, 1968) i. 219-55. MUSTAFA BIN
ABDULLAH HAJI KHALIFEH, TUHFAT AL-KIBAR FI ASF
AR AL-BIHAR, TRANS, JAMES MITCHELL (LONDON, 1831)
P.66, ISMAIL H. UZUNCARSILI OSMANLI TRAIHI (ANKARA,
(بقیہ حاشیہ ص ۳۳ پر)

لیکن ہندوستان کے معاملات سے سلیمان کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی، ۱۵۶۴ء میں ہندوستانی حجاج اور سوداگروں کے جہازوں پر پرتگالیوں کی زیادتیوں کی شریف مکہ کی طرف سے اطلاع کے بعد سلیمان نے مصر کے گورنر کو حکم دیا کہ دس کشتیوں کا ایک شاہی بیڑہ پرتگالیوں کے خاتمہ کے لیے عدن روانہ کر دے۔ سلطان کے بیان کے مطابق اس بیڑہ کا مقصد دشمن کو تباہ کرنا اور ہندوستانی حجاج اور سوداگروں کو سمندری راستوں پر قزاقی کے کسی اندیشہ کے بغیر سفر کی سہولیات فراہم کرنا تھا[۱] یمن اور جدہ کے گورنروں کے پاس فرامین بھیج دیے گئے کہ رسد اور سپلائی کا انتظام کریں اور روڈیس کے گورنر کو حکم دیا گیا کہ کمک کے طور پر اپنی ایک کشتی عدن بھیج دیں[۲]

1947-59) ii. 381-3, 538, STRIPLING, TURKS AND ARA ۱
ARABS, PP. 89-93, M. LONGWORTH DAMES, THE PORTU
GUESE AND THE TURKS IN THE INDIAN OCEAN IN THE
SIXTEENTH CENTURY, JOURNAL OF THE ROYAL ASIATIC
SOCIETY (1921), PP. 15-20, ZAINUDDIN TUHFAT AL-MUJAH
IDIN, P. 75, M. ABIR ETHIOPIA AND THE RED SEA (LOND-
MD, vi. 122, FARMAN NO 256, 13 RE-۱ ON, 1980) PP. 118-19)
MD, vi. 122. FARMAN NO ۲ ABIULEVVEL 972 (19 OCT. 1564)
257, 13 REBIULEVVEL 972, GOVERNER OF YEMEN, IBID,
(بقیہ حاشیہ ص ۳۴ پر) P.123 FARMAN NO. 258, GOVERNER OF JEDDA,

ان منصوبوں کے ساتھ ایک خط پرتگالی بادشاہ دوم سباستیاؤ (۱۵۵۷-۱۵۷۸) کے نام بھیجا گیا، جس میں ہندوستان سے عثمانی حدود میں داخل ہونے والے مسلمان حاجیوں اور سوداگروں پر پرتگالیوں کے حملوں کی طرف اس کو متوجہ کیا گیا۔ دوم سباستیاؤ کی صلح کی تازہ درخواست کو یاد دلاتے ہوئے سلطان نے یہ واضح کیا کہ اگر پرتگال کو واقعی سلطنت عثمانیہ کے ساتھ صلح کی خواہش ہے تو ہندوستانی حجاج اور سوداگروں پر حملے فوراً بند ہونے چاہئیں، سلطان نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر تم اس علاقہ (ہندوستان) میں بدامنی جاری رکھوگے تو پھر تمہارے خلاف مناسب اقدامات کیے جائیں گے[۱]۔

ایسا لگتا ہے کہ دوم سباستیاو سلطان کی دھمکیوں سے متاثر نہیں ہوا، پرتگالی مسلمانوں کے جہازوں کو نشانہ بناتے رہے، اس کی تائید عثمانی دستاویزات سے ہوتی ہے، مصر کے گورنر کے نام ۱۷ جنوری ۱۵۶۸ء کے ایک فرمان نے ہندوستانی مسلمانوں پر پرتگالیوں کے حملوں، ہندوستانی بندرگاہوں پر پرتگالیوں کے تسلط

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳) IBID, P. 121, FARMAN NO 265, 15 RABIULE-
MD, VI. 166, 6 REBIULEVVEL- [۱] -VVEL 972 (21 OCT. 1564)
-973 (1 OCT. 1565), UZUNCARSILI, OSMANLI TARIHI, III. PT.
1, PP. 331-2, N. A. ASRAR KANUNI SULTAN SULEYMAN
DEVRINDE OSMANLI DEVEL-ISLAM ALEMI (ISTANBUL, 1972), PP. 335-6,
-ETININ DINI
شاہ پرتگال کے نام روانہ کیے گئے ایک اور نامہ شاہی کے لیے ملاحظہ ہو: MD, V. 71,
NO. 161-

مکہ مکرمہ کے بحری راستہ کی حصار بندی اور ہندوستان کے حاجیوں کو پیش آنے والے مسائل کی زندہ تصویر کھینچی ہے۔ اس کا اعلان کرتے ہوئے کہ ہندوستان کے کچھ حصوں کا کافروں کے قبضہ میں چھوڑے رکھنا مناسب نہیں ہے۔ سلطان نے اعلان کیا کہ ہندوستان سے پرتگالیوں کو باہر نکالنے کی تیاری میں ایک شاہی بیڑہ تیار کیا گیا ہے جسے بحر اوسط سے ایک نہر کے راستہ سے سوئز کی خلیج میں تعین کیا جائے گا، گورنر سے کہا گیا تھا کہ وہ سلطان کو فوراً اطلاع دے کہ کیا اس نہر کا منصوبہ قابل عمل ہے یا نہیں[۱]۔

یہ منصوبہ جس کا مقصد بحر احمر اور بحر ہند میں بحر متوسط کے شاہی بیڑہ کی کارروائی کو آسان بنانا تھا۔ عثمانیوں کو اس قابل بنا سکتا تھا کہ بحر ہند میں پرتگالیوں کی بنیادوں پر حملہ کریں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یا تو ختم کر دیا گیا تھا یا اس پر ضروری کارروائی نہیں کی گئی، کیونکہ بعد کے عثمانی مراجع اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے ہیں، شاید یہ زیادہ دلچسپی کی بات ہے کہ اس منصوبہ کا مقصد یہ تھا کہ پرتگالیوں کو ہندوستان سے باہر نکالا جائے اور حاجیوں کے لیے راستہ کی آسانی پیدا کی جائے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عثمانیوں کے لیے مکہ مکرمہ کے حج کے راستوں کا کھولنا اور ان کی حفاظت کرنا کس قدر اہم تھا۔

سولھویں صدی کے نصف آخر میں پورے عالم اسلام سے استنبول درخواستیں پہونچیں کہ فرنگیوں کے ظلم سے بچایا جائے اور مشرق سے مقدس شہروں کو جانے والے راستوں کو کھولنے میں مدد کی جائے۔ اچین (سماترا) کا حکمران سلطان علاء الدین ریات شاہ القاہر (۱۵۴۸-۱۵۷۱) ان درخواست دہندگان میں سے ایک تھا، ۱۵۶۶ء میں

[۱] MD, VII. 258, NO. 721-

اس نے سلیمان اعظم کے پاس ایک درخواست بھیجی۔ اس منفرد دستاویز میں سلطان کو خلیفہ اسلام، جانشین خلفائے راشدین اور پناہ گاہ انسانیت وغیرہ کے القاب سے خطاب کیا گیا ہے، اس کے بعد فرنگی جارحیت پسندوں کے سامنے مکہ مکرمہ اور دوسری عرب بندرگاہوں کو جانے والے مسلمان حاجیوں اور تاجروں کی حالت زار کا تذکرہ کیا گیا ہے سلطان سے بار بار اسلام کے نام پر درخواست کی گئی ہے کہ ان کی فوری امداد کرے، فرنگیوں کے خطرہ سے نجات دلانے کے لیے مردان کارزار اور اسلحہ کے ذخائر روانہ کرے اور غیر مسلموں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دے۔ اس درخواست میں سلطان کو اطلاع کی گئی کہ کالی کٹ اور سری لنکا کے مسلمان اس کے نام کا خطبہ پڑھتے ہیں اور ان حکومتوں کے غیر مسلم حکمران سلطان کے جھنڈے تلے فرنگیوں سے لڑنا چاہتے ہیں، درخواست دہندہ اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر عزتمآب کی امداد نہیں آتی ہے تو کمینے غیر مسلم بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہیں گے۔ یہ درخواست سلطان کی طویل حیات اور اس کی ثروت اور شوکت کے دوام کی دعا پر ختم ہوتی ہے [1]

---

[1] HINDISTAN MUSULMANIN BIR ARIZASI TSMA, E 8009, MIDDLE OF THE MONTH OF JUMADA II 973 (JAN. 1566) درخواست کے عنوان سے لگتا ہے کہ درخواست دہندگان ہندوستانی مسلمان تھے، لیکن اندرونی شہادت بتاتی ہے کہ یہ درخواست سماترہ کے سلطان نے بھیجی تھی، بہت سی عثمانی دستاویزات سماترہ کے باشندوں کی نسبت ہند کی طرف کرتی ہیں، اس درخواست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سماترہ اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ۱۵۶۵ء سے پہلے سے تعلقات تھے، اس اہم دستاویز کو مورخین کے سامنے لانے کا شرف مقالہ نگار کو حاصل ہے، سماترہ اور عثمانی سلاطین کے باہمی تعلقات کے لیے ملاحظہ ہو: (بقیہ حاشیہ ص ۳۷ پر)

اس درخواست کے مضمون سے متاثر ہو کر سلیم دوم نے جو ۱۵۶۶ء میں سلیمان کا جانشین ہوا تھا فوری اقدام کیے، اس نے توپوں، بندوقوں اور دوسرے فوجی سازوسامان سے لیس پندرہ کشتیوں اور دو بارکوں کو سماترا بھیجنے کا فیصلہ کیا، متعدد جانیزاریوں، سات ماہر بندوقچیوں اور اسلحہ کے شاہی افسر اعلیٰ کو اس مہم میں شریک ہونے کا حکم دیا گیا، متعدد بڑھئیوں، کان کنوں، لوہاروں اور رنگ ریزوں کو بیڑہ کے ساتھ جانے کی ہدایت کی گئی، اسکندریہ کے بیڑہ کے کپتان خضر کرمت اولو کو مہم کی سربراہی کے لیے نامزد کیا گیا اور اسے کافروں کو تباہ کرنے اور ان کے قلعوں پر قبضہ کرنے میں سلطان اچین کی مدد کرنے کی ہدایت کی گئی [1] صوبائی گورنروں اور شاہی افسروں کو احکام دیے گئے کہ ضروری سازوسامان فراہم کر دیں [2]۔ سلطان اچین کے نام خط میں سلطان نے کافروں کے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶) ANTHONY REID, SIXTEENTH CENTURY TURKISH INFLUENCE IN WESTERN INDINESIA, JOURN-AL OF SOUTHEAST ASIAN HISTORY, X (1969) 405.

[1] MD, vii. 90-92, No. 244, 16 REBIULEUVEL 975 (20 SEPT. 1567) iBID, P. 89, No 238, 17 SEP. 1567, iBID, P. 311, No. 887, 17 SHABAN 975 (16 FEB. 1568) MD, vii, 88, No. 236, 17.

[2] MD, vii. 87, No. 234, GOVERNER OF EGYPT, SEPT. 1567 iBID, No. 237, GOVERNER OF YEMEN, iBID, 89, No. 234, GOVERNER OF EGYPT, iBID, 90, No. 242, SHERIF OF ME-CCA, iBID, 90, No. 43 GOVERNER OF EGYPT, (بقیہ حاشیہ ص ۳۸ پر)

خلاف جہاد کے التزام کا اعادہ کیا اور یہ واضح کیا کہ سماترہ کو کفر کے شر سے محفوظ رکھنے، سرزمین مقدس کے راستہ کو تمام رکاوٹوں اور خطروں سے صاف کرنے اور سماترہ کے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ بیڑہ بھیجا جارہا ہے۔[1]

لیکن یہ بیڑہ کبھی منزل کے لیے روانہ نہیں ہوا۔ جنوری ۱۵۶۸ء میں سماترہ کے سفیر کو مطلع کیا گیا کہ یمن میں بغاوت فرو کرنے کے لیے بحری بیڑہ وہاں بھیج دیا گیا ہے، تاہم سلطان نے سفیر کو سماترہ کے ساتھ اپنی غیر منقطع ہونے والی مدد کا یقین دلایا اور اگلے سال بیڑہ روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔[2] گو ایسا نہیں ہوا، لیکن پرتگالی اور جیسوت

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷) IBID. 177, NO. 474, GOVERNER OF EGYPT, IBID., 179, NO. 481, LORD ADMIRAL, IBID, 182, NO. 491, LORD ADMIRAL, IBIDD. 211, NO. 583, GOVERNER OF EGYPT, IBID, 212, NO. 586, CAPTAIN OF SUEZ, IBID, 219, NO. 610 PIYALE PASHA, THE LORD ADMIRAL

[1] MD, VII. 90-2, NO. 224, 20 SEPT. 1567. SAFVET BEY, BIR OSMANI FILOSININ SUMATRA SEFERI, TARIH OSMANI ENCUMAN MECMUASI, 10, AH 1329, PP. 604-14. IBID, TOEM 11, AH 1329, PP. 672-83, SAFVET BEY, SHARQ LONDLERI, OSMANI BAHRA-I-AHMAR FILOSININ SUMATRA SEFERI UZERE VASIQALAR, TOEM, 24, AH 1332, PP. 1, 521-40

[2] MD, VII. P. 255, NO. 708, 15 RAJAB 975 (15 JAN. 1568) IBID, 216, NO. 597, 29, JUMADA 1 975 (1 DEC. (بقیہ حاشیہ ص ۳۹ پر)

مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عثمانی فوجی امداد سماترہ پہنچی۔ سماترہ کے ایک ماخذ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں اور کاریگروں سے لدے دو جہاز اور بندوقیں سلطان کے پاس سے سماترہ پہنچیں لیکن یہ امر محل نظر ہے، البتہ مجوزہ مہم سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر جگہ حاجیوں کے لیے راستہ کی سہولیات فراہم کرنے کو عثمانی سلاطین سنجیدگی سے اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور جب بھی ضرورت پڑتی اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اسی طرح کی عثمانی امداد کی درخواستیں وسطی ایشیا سے بھی آئیں، ۱۵۵۶ء میں اصطرخان پر روسیوں کے قبضہ سے ترکستانی مسلمانوں کے لیے اب تک کھلا حج کا راستہ مسدود ہوگیا تھا، اصطرخان کی راہ اختیار کرنے والے مسلم حاجیوں اور تاجروں پر روسی مظالم کی متعدد رپورٹیں اس سے پہلے استنبول پہنچ چکی تھیں۔[1] ۱۵۶۸ء میں خوارزم کے حاکم حاجی محمد خان (۱۵۶۰-۱۶۰۳) نے ایک خصوصی سفیر استنبول بھیجا، سفیر کے ذریعہ لائے گئے خط نے شاہ ایران کے ہاتھوں خوارزمی حجاج کے ساتھ بدسلوکی کی اطلاع سلطان کو کی اور اصطرخان کے متبادل راستہ کے کھولنے کی سلطان سے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸) 1567), IBID. 23, 614, IBID, 224, NO. 616, IBID

[1] A. N. 311, NO. 887, 17 SHABAN 975 (16 FEB. 1568) KURAT, THE TURKISH EXPEDITION TO ASRRAKHAN AND THE PROBLEM OF THE DON-VOLGA CANAL, THE SLAVONIC AND EAST EUROPEAN REVIEW, XXXIX (1961), 13.

درخواست کی[1]۔ اصطرخان اور قازان کو فتح کرنے کی درخواستیں سمرقند اور بخارا کے اوزبکوں سے بھی موصول ہوئی تھیں[2]

عثمانیوں کو تحتی ونگا میں روسیوں کے گھس آنے کی اطلاع تھی اور وہ اصطرخان کے خلاف مہم کی کامیابی کے امکان پر پہلے ہی سے غور کر رہے تھے کہ وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی گزارشات نے سلطان کو فوری طور پر متحرک ہونے پر آمادہ کیا، سلطان نے ۱۵۶۸ء میں کفا کے گورنر کو ایک فرمان بھیجا جس میں اصطرخان کے راستہ سفر کرنے والے وسطی ایشیا کے حاجیوں اور سوداگروں پر روسی مظالم کے حوالہ سے روسیوں سے حج کے راستہ کو آزاد کرنے کے لیے اصطرخان کی فتح کے اپنے ارادہ کا اظہار کیا اور گورنر کی رائے معلوم کی کہ اس پر حملہ کرنے کا کون سا بہترین وقت ہوگا۔[3] تین ہفتوں کے بعد سمرقند، بخارا اور خوارزم کے حاجیوں اور سوداگروں کے راستہ کے لیے اصطرخان کو فتح کرنے کی سلطان کی خواہش کے اظہار کے لیے کریمیا کے خان دولت

---

[1] LETTER OF SELIM II TO THE KHAN OF KHWAR-
-AZM, MD, VII. 985, NO. 2, 723, HALIL INALCIK THE OR-
-IGIN OF THE OTTOMAN-RUSSIAN RIVALRY AND
THE DON-VOLGA CANAL, ANNALES DE L UNIVERSI-
-TED, ANKARA, I. (1946-7) 68. [2] A. REFIK, BAHR-I-
HAZER-KARADENIZ KANAL VE EJDERHAN
A. REFIK, BAHR [3] SEFERI, TOEM, 43, AH 1333, P.4.
P.4. [4] فرمان روانہ کرنے کی تاریخ ہے ۱۵ شعبان ۹۷۵/ ۱۴ فروری ۱۵۶۸ء

غیرے خان (۱۵۵۱۔ ۱۵۷۷) کے نام اسی طرح کا ایک فرمان بھیجا گیا جس میں مہم کی ضرورت کے پیش نظر رسد کے جمع کرنے کی ہدایتیں دی گئیں[1]

اصطرخان کی مہم سے مربوط دون اور ولگا کے دریاؤں کے درمیان ایک نہر کی تعمیر کا منصوبہ تھا جس کا مقصد دریائے ولگا میں عثمانی بیڑہ کی کارروائی کو آسان کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اصطرخان میں کمک کی غرض سے آنے والی روسی فوجوں کو دریا کے استعمال سے روکنا اور اصطرخان کے محاصرہ کے لیے ضروری اسلحہ جات کو وہاں تک پہونچانا اس منصوبہ کا مزید مقصد تھا۔[2] مئی ۱۵۶۹ء میں روانہ کی گئی یہ مہم فوری طور پر مشکلات میں پھنس گئی، غیر کافی ٹکنیکل معلومات کی وجہ سے نہر کا منصوبہ جلد ہی ناقابل عمل محسوس ہونے لگا اور اسے چھوڑنا پڑا۔ محاصرہ کرنے والی توپوں کی کمک کے بغیر عثمانی فوجیں اصطرخان کے دفاعی مورچوں پر مشکل سے اثر انداز ہونے کی توقع کر سکتی تھیں، اچانک حملہ کے ذریعہ قلعہ پر قبضہ کرنے کی متعدد ناکام کوششوں کے بعد انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا[3] اور اصطرخان کو عثمانی آزاک سے ملانے والے

---

[1] IBID., PP.4-5. THE FARMAN WAS ISSUED ON 5
RAMADAN 975 (4 MARCH 1568) IBID. PP. 5-6. 4 MU-
-HARRAM 976 (29 JUNE 1568) [2] KURAT TURKISH
KURAT, TURKISH EZ- [3] -EZPEDITION, P.18.
-PEDITION, PP. 18-21, INALCIK, DON-
VOLGA CANAL, PP. 78-86, ALLEN TURKISH
POWER, PP. 26-28.

حج کے راستہ کی آزادی کی امیدوں پر اس طرح اوس پڑگئی۔

بہرحال اس ناکام مہم سے ایک مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔ ۱۵۷۰ء میں روس کے حکمران ایوان چہارم (۱۵۳۳-۱۵۸۴) نے ایک سفیر کے واسطہ سے ایک خط استنبول بھیجا جس میں سلطان کو اصطرخان اور قازان کے مسلمانوں سے اپنی ہمدردی کا یقین دلایا اور سلطنت عثمانیہ کے ساتھ صلح کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا، سلطان نے جواب دیا کہ وہ روس کے ساتھ دوبارہ صلح کے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے بشرطیکہ ایوان اصطرخان کا راستہ کھول دے اور وسطی ایشیا سے مکہ مکرمہ جانے والے حاجیوں اور مسلمان سوداگروں کے تحفظ کی ضمانت دے۔[۱] ایوان نے یہ شرط منظور کی اور روس کے ساتھ صلح ہوگئی، ایوان کے جانشین زار فیوڈر (۱۵۸۴-۱۵۹۸) نے ۱۵۸۵ء اور ۱۵۹۵ء میں اصطرخان اور قازان کے مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے اپنے والد کے عہد کا اعادہ کیا۔[۲] مختصر یہ کہ اگرچہ عثمانیوں کو دو قدیم مسلمان صوبوں پر روسی تسلط کو تسلیم کرنا پڑا، تاہم انہوں نے روسیوں کو (خواہ وقتی طور سے ہی) مقامی مسلمانوں کے مذہب کے احترام پر آمادہ کرلیا۔

اصطرخان کی مہم حج کے راستہ پر کسی عیسائی طاقت کے تسلط کو ختم کرنے کی عثمانیوں کی آخری کوشش ثابت ہوئی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں عثمانی سلاطین برابر قاہرہ اور دمشق سے بڑی شان کے ساتھ حج کے قافلوں کا انتظام کرتے رہے، حاجیوں اور حج کے راستوں کے تحفظ پر بڑی رقمیں خرچ کرتے رہے اور مقدس شہروں کی دیکھ بھال کے لیے کافی رقمیں اور غلہ جات حجاز روانہ کرتے رہے۔ استنبول میں باشوکالت آرکائیوز میں حج اور حج کے مختلف مسائل سے متعلق سیکڑوں

[۱] منشآت السلاطین ۲/ ۴۶۰-۱۔ [۲] INALCIK, DONG-VOLGA CANAL, PP. 94-7.

دستاویزوں کی موجودگی حج سے عثمانی حکومت کی گہری دلچسپی کی شہادت دیتی ہے۔[۱] لیکن یورپ کے اندر سلطنت عثمانیہ کی طویل جنگیں اور زوال کی وہ علامتیں جن کی اس وقت ابتدا ہوچکی تھی عثمانیوں کو حملہ آورانہ کارروائیوں کا موقع نہیں دے رہی تھیں۔ اس کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ سولہویں صدی کے بعد عثمانی سلاطین نے اپنے زیر اثر علاقوں کے باہر حاجیوں یا حج کے راستوں کے تحفظ کے لیے کسی قسم کی کوئی کوشش کی، کم از کم عثمانی دستاویزات اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انیسویں صدی میں وسائل حمل و نقل میں انقلابی تبدیلیوں کے ذریعہ جب طویل مسافتوں کی دشواریوں کا خاتمہ ہوا تو اس کے بعد ہی دنیا کے مختلف علاقوں کے مسلمان بغیر کسی رکاوٹ کے مکہ مکرمہ کا سفر کرنے کے اہل ہوسکے۔

[۱] مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: MD, iii. 309, No. 905, iBiD, P. 525, No. 1, 553: iBiD, P. 370, No. 1, 094, MD, iv. 26, No. 241, iBiD, P. 172, NoS. 1, 787, 1,788, iBiD, P. 204, No. 2, 139, MD, V. 205, No. 508, iBiD, P. 208, No. 520, iBiD, P. 358, No. 944, iBiD, P. 150, No. 549, iBiD, P. 395, No. 1, 046, MD, vii. 240, No. 667, iBiD, No. 671, iBiD, P. 523, No. 1, 501, iBiD, P. 633, No. 1, 506, iBiD, P. 744, No. 2, 037, iBiD, P. 748, No. 2, 048, iBiD, P. 525, NoS. 1, 505, 1, 506, MD, ix. 1, No. 3, iBiD, P. 10, No. 26, MD, xii. 70, No. 34, iBiD, P. 351, No. 710, iBiD, P. 426, No. 827, iBiD, P. 445, No. 862, iBiD, P. 448, No. 868, iBiD, P. 467, No. 896, iBiD, P. 478, No. 918, MD, XV. 100, No. 871-

قرون وسطی کے مسلمان حکمرانوں کی ذمہ داری تھی کہ حج کے راستوں کی حفاظت کریں، حج کے سالانہ قافلوں کا انتظام کریں اور اپنی رعایا کو حج کی سہولیات فراہم کریں، ہندوستان کے مغل شہنشاہ اور ترکی کے عثمانی سلاطین اس ذمہ داری سے مستثنی نہیں تھے، البتہ اس سے عہدہ برآ ہونے کی مغلوں کی کوششوں کو بہت معمولی کامیابی حاصل ہوئی، حج کے بری و بحری دونوں راستے باہر کی طاقتوں کے زیر تسلط تھے اور سترہویں صدی میں بحر ہند میں طاقتور قزاقوں کے ایک نئے گروہ کے غلبہ سے مسئلہ اور زیادہ سنگین ہوگیا تھا۔ ہندوستانی حاجیوں کو یا تو مذہبی مظالم کے سامنے جھکنا پڑتا یا پھر وہ جان و مال کی تباہی کے ممکنہ خطرہ کو قبول کرکے سفر اختیار کرتے۔ سمندر میں مغلوں کی بے بسی اس صورت حال کی بڑی حد تک ذمہ دار تھی، اس کی وجہ سے وہ یورپ والوں کے مطالبات ماننے پر مجبور تھے۔ اورنگزیب تنہا مغل شہنشاہ تھا جس نے حاجیوں کے لیے سمندر کے راستہ کو محفوظ کرنے کی سنجیدہ کوشش کی، اگرچہ کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی، یورپ کی ملاحی، بحری فوجی ٹکنالوجی اور اسلحہ جات اس قدر ترقی یافتہ تھے کہ ان کا مقابلہ مشکل تھا۔

صفوی ایران کو وسطی ایشیا کی ابھرتی ہوئی طاقت ازبکوں کے مدمقابل دیکھنے کی سیاسی خواہش بھی ہندوستانی حجاج کی بے چارگی کی ذمہ دار ہے۔ مکہ کے خشکی کے راستہ پر صفویوں کے تسلط کو مغلوں نے چیلنج نہیں کیا، اس بات کی کوئی کوشش بھی نہیں کی گئی کہ صفوی علاقہ سے ہو کر مکہ مکرمہ جانے والے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے رعایت حاصل کرنے کے لیے صفویوں کو آمادہ کیا جائے، یقیناً یہ تعجب خیز ہے کہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں مغلوں اور صفویوں کے درمیان کثرت سے

سفارتوں اور قاصدوں کی آمد و رفت کے باوجود ایران کے حج کے راستہ کی رکاوٹیں کبھی زیر گفتگو نہیں آئیں، مغلوں کے لیے شمال مغربی سرحد کو مشکلات سے آزاد رکھنے کی ضرورت اس سے کہیں زیادہ اہم تھی کہ حاجیوں کی ضروریات کے مسئلہ پر ایرانیوں کے ساتھ جنگ کا خطرہ مول لیا جائے۔

ہندوستانی حکمرانوں کے مقابلہ میں حج کے راستوں کی حفاظت عثمانی سلاطین کے لیے زیادہ آسان تھی۔ سولھویں صدی میں جب وہ اپنی طاقت کے اوج پر تھے تو انھوں نے ذمہ داری پورا کرنے کی مکمل کوشش کی۔ ہندوستانی سمندر اور خلیج ایران سے پرتگالیوں کو باہر نکالنے کی تدبیریں کی گئیں، فوجی امداد سماترہ بھیجی گئی، وسطی ایشیا کے حج کے راستہ کو روسیوں سے آزاد کرنے کے لیے اسطرخان پر حملہ کیا گیا، لیکن پرتگالی اور روسی اس قدر طاقتور تھے کہ ان کو پسپا کرنا آسان نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اپنی طاقت کے مرکز سے بہت دور ایک طاقتور دشمن سے جنگ کرنے کے مسائل نے عثمانی منصوبہ بندیوں کو پست اور ناکام کردیا، سترہویں صدی میں عثمانی طاقت کا زوال شروع ہوگیا اور سلطنت کے اندرونی اور بیرونی مسائل بڑھتے گئے، نتیجتاً عثمانی سلاطین حجاج کے لیے مکہ کے راستوں کی حفاظت نہ کرسکے۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ ہندوستانی حاجیوں کے لیے محفوظ گزرگاہ کی سہولیات کی فراہمی انگریزوں کے غلبہ کی مرہون منت تھی۔

مولانا آزاد بلگرامی کی فارسی خدمات

از ڈاکٹر سید حسن عباس

(۲)

مناقب میں ان کی صرف ایک تصنیف ہے۔

۱۔ سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات: یہ مختصر سا رسالہ سادات کے فضائل و مناقب کے بیان میں ہے جس میں سادات کی فضیلت آیات قرآنی و احادیث وغیرہ سے بیان کی گئی ہے۔ اس کا سال تالیف معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ آزاد نے اس کی تالیف میں جن سولہ مآخذ سے استفادہ کیا ہے ان کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۰۸ھ میں بمبئی سے ۳۲ صفحات میں شایع ہو چکی ہے۔

آزاد کی ادبی تصنیفات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ دیوان فارسی: آزاد بلگرامی کا دیوان غزلیات، قصائد، مثنویات، رباعیات اور قطعات تاریخ پر مشتمل ہے جو بلا مبالغہ تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کا کلام ان کی قادر الکلامی، مہارت اور گوناگوں افکار و خیالات کے خوبصورت اظہار کا مظہر ہے۔ مکمل دیوان ابھی شایع نہیں ہوا ہے، صرف دو انتخابات حیدرآباد سے ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء میں شایع ہوئے تھے۔ دیوان آزاد کے متعدد قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ آزاد کے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانۂ گنج بخش اسلام آباد میں اور دوسرا

کتابخانۂ مجلس شورائے اسلامی تہران میں بھی موجود ہے۔ ان دونوں نسخوں کے عکس راقم السطور کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ کتابخانۂ رضا رام پور میں دو، ندوۃ العلما لکھنؤ میں ایک، دانش گاہ عثمانیہ حیدرآباد میں ایک، نیشنل میوزیم کراچی میں ایک، خدا بخش لائبریری میں ایک، انڈیا آفس لندن میں ایک، کتابخانۂ حمیدیہ بھوپال میں ایک، برٹش میوزیم میں ایک، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں تین، سالار جنگ میوزیم میں دو، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں ایک، کتابخانۂ آصفیہ میں ایک اور ایران کے معروف محقق استاد گلچین معانی (مشہد) کے ذخیرۂ کتب میں ایک نسخہ موجود ہے اشپرنگر نے اپنی فہرست میں بھی آزاد کے ایک دیوان کا ذکر کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کم سے کم جتنے نسخے مل سکیں ان کی مدد سے آزاد کا مکمل دیوان مرتب کر کے شایع کر دیا جائے۔

۲۔ بیاض: آزاد کی قلمی بیاضیں خدا بخش لائبریری، ندوۃ العلماء اور سالار جنگ میں موجود ہیں۔ سالار جنگ کی بیاض سے پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے ان کے دو اردو اشعار نقل کر کے روضۃ الاولیا کے مقدمہ میں شایع کر دیا ہے یہ بیاض بھی کافی اہم ہے لیکن اسے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ خدا بخش لائبریری میں آزاد کی بیاض کا نمبر ۳۱۴۳ ہے۔ اس کے صفحۂ اول پر ان کی تحریر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بیاض بلگرام سے سفر حج کے آغاز کے وقت ایک ہفتہ میں مکمل کی تھی اور چلتے وقت میر محمد یوسف بلگرامی کو دے گئے تھے۔ اس یادداشت کے ساتھ ان کی بیضوی مہر بھی ثبت ہے۔ اس بیاض کے لیے انہوں نے ایک قطعۂ تاریخ بھی کہا اور "بیاض رنگین" سے اس کی تاریخ نکالی جو ۱۱۴۳ھ ہوتی ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تاریخ آغاز بیاض کی ہوگی ورنہ ان کا سفر حج تو ۱۱۵۰ھ میں شروع ہوتا ہے اور تاریخ بیاض بھی اسی سال کے آس پاس کی ہونا تھی۔ یہ بیاض ۱۶۲ اوراق پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف شعرا کے مختلف موضوعات کے تحت اشعار اور متفرق یادداشتیں ہیں۔ اکثر مشتملات بیاض آزاد کے خط میں ہیں۔

آزاد بلگرامی کی تیسری بیاض کتابخانہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں موجود ہے جس کا عکس مجھے ڈاکٹر احسن الظفر استاد زبان وادبیات فارسی لکھنؤ یونیورسٹی کے تعاون سے حاصل ہوا تھا۔ نہ صرف یہ بیاض بلکہ ڈاکٹر احسن الظفر نے مختلف مخطوطات اور مطبوعہ کتابوں سے آزاد بلگرامی کے متعلق بہت سی یادداشتوں کے زیراکس بھی مجھے مہیا کیے تھے۔ ان کے اس علمی تعاون کے جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہوگا۔

بہرحال مذکورہ بیاض "آزاد بلگرامی کی بیاض بخط آزاد" سے نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے سید جلیل احمد سہسوانی سے نقل کرایا تھا۔ جلیل احمد نے ذیقعدہ ۱۲۹۷ھ میں نقل نویسی کا کام شروع کیا تھا اور ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ میں مکمل کر لیا تھا۔ یہ بیاض بھی ہندوایران کے فارسی گو شعرا کے کلام پر مشتمل ہے جس کا آغاز فیضی سے اور اختتام جلال اسیر پر ہوتا ہے۔ نواب صدیق حسن خاں کے بیٹے نورالحسن نے بھی جن کا تذکرہ نگارستان سخن معروف ہے "بیاض دستخط خاص میر آزاد"[1] سے استفادہ کیا اور یہ بیاض ان کا ماخذ رہی ہے۔ ندوۃ العلماء میں موجود آزاد کی بیاض میں ۲۷۷ شعرا کے کلام کا انتخاب موجود ہے۔ آزاد جیسے تذکرہ نویس کے لیے یہ بیاض کافی اہمیت کی حامل تھیں۔

---

[1] نورالحسن: نگارستان سخن، ۱۶۱۔

۳۔ شرح قطعۂ نعمت خان عالی شیرازی: بارہویں صدی ہجری میں ہجوگوئی کافی رائج تھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اس کے وافر نمونے ملتے ہیں۔ تذکروں میں بھی ہجویہ اشعار کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً خان آرزو نے اپنے تذکرہ مجمع النفایس میں شفیعا اثر، سعید اشرف، بنائی، جلال نائینی، شرمی، غضنفر، غیاث نقشبند، مہری، قاضی نوراللہ شوستری، زمانائے نقاش اور یحیی کاشی کے تراجم میں ان کے ہجویہ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ اسی طرح کشن چند اخلاص نے اپنے تذکرہ ہمیشہ بہار میں شیدا، عالمی اور عاشق کے میر الٰہی، غزالی اور غبار کے سلسلے میں ہجویہ اشعار درج کیے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ بسا اوقات ہجویہ اشعار بھی بڑے معنی خیز اور بلندی خیال کے حامل ہوتے ہیں، قطعہ نعمت خاں عالی شیرازی بھی ایسے ہی معنی خیز اور پیچیدہ و سربستہ خیالات و افکار کا حامل ہے۔ اس قطعہ کے بارے میں شفیق اورنگ آبادی نے تذکرہ گل رعنا میں نعمت خاں کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ:

"قطعہ ہجو کامگار خان پسر دوم عمدۃ الملک جعفر خان وزیر اعظم خلد مکان دارد' زبان زد عالم است، عالمانہ نظم کردہ ..."

عالی نے کامگار خاں کی شادی پر یہ قطعہ کہا تھا۔ اس کی شادی ۱۰۷۷ھ میں فتح حیدرآباد کے بعد سید مظفر وزیر سلطان ابوالحسن والی حیدرآباد کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ عالی کا قطعہ ۲۵ اشعار پر مشتمل ہے جو کامگار خان کی عروسی کی ہجو میں ہے۔ اس نے اس قطعے میں بے شمار علمی، ادبی، نجومی اصطلاحیں استعمال کر کے کامگار خان کی جنسی کمزوریوں اور اپنی عالمانہ حیثیت کو ظاہر کیا ہے۔ مولانا آزاد نے اس قطعے کی شرح لکھی اور لفظی و معنوی موشگافیوں کے ذریعے قطعۂ مذکور کے اسرار سربستہ کو

واضح کیا ہے۔ شرح لکھتے وقت انہوں نے پانچ کتابوں کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔

یہ شرح ۱۲۶۰ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ آزاد نے تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں بھی عالی کے ترجمہ میں اسے نقل کیا ہے۔ کتابخانۂ مرکزی دانشگاہ تہران میں میری نظر سے اس قطعے کی ایک اور شرح گزری ہے جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن شارح نے آزاد کی شرح کو پیش نظر رکھ کر ایک اور شرح کی ہے۔ مذکورہ نسخہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۷۹ھ کا مکتوبہ ہے اور کاتب میر غلام حسین رضوی ہیں۔

۴۔ **غزلان الہند** : آزاد بلگرامی کی ایک اہم تالیف غزلان الہند ہے۔ یہ ان کی عربی تصنیف سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان کی آخری دو فصلوں کا ترجمہ ہے جسے خود آزاد نے اپنے دو شاگردوں لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور میر عبدالقادر مہربان اورنگ آبادی کی فرمایش پر ۱۱۷۸ھ میں کیا اور مقدمہ و خاتمے کا اضافہ کیا۔ 'غزلان الہند' تاریخی نام ہے جس سے ۱۱۷۸ھ برآمد ہوتا ہے اور رسالے کا موضوع علم بدیع اور صنایع شعری ہے۔ مقدمہ میں علم بدیع کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ اس کتاب پر راقم السطور کا ایک مقالہ خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۷۶-۷۷ میں شایع ہوا تھا۔ راقم نے چار مختلف نسخوں کی مدد سے متن کی تصحیح کا کام بھی مکمل کر لیا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کی اشاعت عمل میں آئے گی۔

۵۔ **مثنوی طلسم اعظم** : آزاد نے یہ مثنوی ۱۱۵۰ھ میں بلگرام سے حج کے لیے جاتے وقت لکھی تھی۔ اس کا تاریخی نام بھی یہی ہے۔ اس مثنوی میں انہوں نے حج کا سفرنامہ بیان کیا ہے اس کے ۴۴ اشعار انہوں نے مآثر الکرام میں نقل کیے ہیں۔ ابھی تک اس کے مکمل نسخے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔

۶۔ **مثنوی در صفت مدینہ** : یہ ۷۶ ابیات پر مشتمل ایک مختصر سی مثنوی ہے۔ اس میں انہوں نے مدینہ منورہ کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرۂ احسن مارہروی میں موجود ہے۔ دیوان کے نسخوں میں یہ مثنوی نہیں ملتی۔

۷۔ **مثنوی سراپائے معشوق** : یہ مثنوی جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے معشوق کے سراپا کی تعریف کے بیان میں ہے یہ ایک مقدمہ اور چند وصف پر مشتمل ہے۔ اس کا سال تالیف معلوم نہیں ہو سکا اور نہ ہی آزاد کے تذکرہ نویسوں نے اس بارے میں کوئی اشارہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ آزاد نے عربی میں ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں مرآت الجمال کے نام سے سراپائے معشوق نظم کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد انہیں اسے فارسی میں بھی نظم کرنے کا خیال آیا ہو یا عربی میں فارسی کے بعد نظم کیا ہو۔ عربی میں یہ نظم ایک سو پانچ اشعار پر مشتمل ہے جبکہ فارسی نظم میں اشعار کی تعداد ۱۲۱۵ ہے۔

خضر بانو صاحبہ نے مرآۃ الجمال کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک قصیدہ بتایا ہے[1] جو صحیح نہیں ہے۔ اسٹوری نے مرآۃ الجمال اور سراپائے معشوق کو ایک ہی چیز سمجھا ہے۔

آزاد نے اس مثنوی میں اپنی شاعرانہ قادر الکلامی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ مثنوی بھی شایع نہیں ہوئی ہے اور اس کے متعدد نسخے کتابخانوں میں ملتے ہیں۔ قدیم ترین نسخہ جو ۱۱۶۵ھ کا مکتوبہ ہے کتابخانۂ مرعشی نجفی قم (ایران) میں موجود ہے لیکن بہت زیادہ کرم خوردہ

---

[1] مجلہ عالمگیر لاہور، سالنامہ ۱۹۳۵ء ص ۱۷۲

ہے۔ ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرہ سبحان اللہ میں بھی ہے جس کے بارے میں قیاس ہے کہ بخط آزاد ہے۔

۸۔ **مثنوی معراج الکمال تکملۂ امواج الخیال** : میر عبدالجلیل بلگرامی (م ۱۱۳۸ھ) نے جو آزاد کے نانا اور استاد تھے، اپنے وطن بلگرام کی تعریف و توصیف میں ایک مثنوی امواج الخیال سنہ ۱۰۹۳ھ میں کہی تھی آزاد نے اس مثنوی کا تکملۂ معراج الکمال کے نام سے کہا۔ یہ مثنوی انہوں نے سنہ ۱۱۵۱ھ میں سفر حج کے دوران مدینہ منورہ میں مکمل کی۔

۹۔ **قصیدہ در تعزیت میر عبدالجلیل و میر سید محمد شاعر بلگرامی** : آزاد نے یہ قصیدہ مذکورہ دونوں اشخاص کی وفات پر کہا تھا۔ اس قصیدے میں ایک سو ایک اشعار اور چار مطلع ہیں۔ قصیدے کے ہر مصرعے اور مطلع کے عنوانات سے تاریخ وفات میر عبدالجلیل نکالی گئی ہے۔ چوتھا مطلع میر سید محمد شاعر بلگرامی (م ۱۱۸۵ھ) ابن میر عبدالجلیل بلگرامی کی مدح میں ہے جو آزاد کے ماموں تھے۔ اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرۂ احسن مارہروی میں موجود ہے۔

۱۰۔ **مثنوی در جواب مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی** : میر عبدالجلیل نے فرخ سیر بادشاہ کی شادی پر ایک مثنوی کہی تھی جو مثنوی در طوی فرخ سیر بادشاہ کے نام سے مشہور ہے، ہو سکتا ہے آزاد بلگرامی نے بھی اسی سلسلے کی کوئی مثنوی کہی ہو۔ یہ مثنوی راقم السطور کے مطالعے میں نہیں آ سکی ہے۔

۱۱۔ **مثنوی در تاریخ شہدائے جنگ نواب سر بلند خان با راجہ ابھے سنگھ زمیندار مارواڑ** : اس مثنوی کے ۱۵۷ اشعار میر سید محمد شاعر بلگرامی نے اپنی تصنیف تبصرۃ الناظرین (قلمی ص ۱۶۵-۱۶۷) میں درج کیے ہیں۔

۱۲۔ **سفرنامہ** : آزاد نے اپنے سفر حج کی تفصیلات لکھی ہیں۔ اس کا واحد نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں موجود تذکرۂ ید بیضا شمارہ ۵۴۶ کے ساتھ ہے (ورق ۱۷۰-۱۷۷)

۱۳۔ **چند نظمیں و رسالے** : مقبول احمد صمدنی نے تفصیلات کے بغیر آزاد کے چند دیگر رسالوں اور نظموں کی طرف اشارہ کیا ہے[1]

آزاد نے درج ذیل کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کی ہے :

۱۔ **مآثر الامرا** : یہ صمصام الدولہ شاہنواز خاں (م ۱۱۷۱ھ) کی مشہور تاریخ و تذکرہ ہے جس میں عہد اکبر سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے سلاطین و امرا اور رجال کا تذکرہ ہے، اسے مصنف نے ۱۱۵۵ سے ۱۱۶۰ھ کے درمیانی برسوں میں بڑی محنت سے تالیف کیا تھا، ابھی کتاب مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ قتل کر دیے گئے اور ان کے اسباب و اموال لوٹ لیے گئے، اس کتاب کا مسودہ بھی اس غارت گری کا شکار ہو کر منتشر ہو گیا۔ آزاد بلگرامی نے جو مصنف کے قریبی دوست تھے، بڑی مشکل سے کتاب کے پراگندہ اوراق حاصل کر کے انکی شیرازہ بندی کی اور کتاب پر مقدمہ لکھنے کے علاوہ نامکمل تراجم کو مکمل کیا اور چند تراجم کا اضافہ کیا۔ یہ کتاب جو بیش قیمت اطلاعات و معلومات کا مجموعہ ہے۔ آزاد بلگرامی کی کوششوں سے اہل ادب کے ہاتھوں میں پہنچ سکی ہے۔ اس لیے یہ ان کا احسان عظیم ہے۔

---

[1] حیات جلیل ۲/۱۷۶۔

مآثر الامرا ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ سے مولوی عبدالرحیم اور مولوی میرزا اشرف علی کی تصحیح کے ساتھ ۱۸۸۸ء، ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۵ء میں تین جلدوں میں شایع ہوچکی ہے۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں اس کے تراجم بھی شایع ہوچکے ہیں۔ اردو میں مرحوم ایوب قادری نے اس کا ترجمہ کیا تھا جو مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شایع ہوچکا ہے۔ جلد اول کا ایک اور اردو ترجمہ کسی نے کیا تھا جس کا مخطوطہ قومی عجائب گھر کراچی میں موجود ہے[1]۔ انگریزی ترجمہ H. BEVERIDGE نے کیا تھا جو ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے شایع ہوا تھا۔ یہی ترجمہ B. PRASHAD کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۴۱ء میں کلکتہ سے ہی تین جلدوں میں شایع ہوا۔

۲۔ انیس المحققین: یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ہے جس میں ہندوستان اور بلگرام کے کچھ صوفیہ و مشائخ کے احوال بھی ملتے ہیں لیکن اس کا خاص موضوع میر سید لطف اللہ معروف بہ شاہ لدھا بلگرامی اور ان سے متعلق کچھ دوسرے افراد کے مکتوبات اور شاہ لدھا کے ملفوظات ہیں۔ میر سید نوازش علی بلگرامی جو شاہ لدھا کے مرید تھے انہوں نے شاہ صاحب کے ملفوظات جمع کرنا شروع کیے تھے اور اس مجموعہ کا نام انیس المحققین رکھا اور آزاد بلگرامی کو نظر ثانی کے لیے دیا۔ آزاد نے اس کی تصحیح و ترتیب کی اور میر سید محمد، میر سید احمد اور کچھ دوسروں کا حال اس میں اضافہ کیا اور کتاب کو چار فصلوں میں مرتب کیا۔

فصل اول: درذکر حضرت قطب الاولیا میر سید محمد۔ یہ فصل ذیل کے دو مقصد پر مشتمل ہے۔

مقصد اول: در احوال و اقوال میر سید محمد۔

مقصد دوم: درذکر فرزندان و مریدان میر سید محمد۔

فصل دوم: درذکر حضرت سلطان الاولیا میر سید احمد۔ اس میں بھی دو مقصد ہے۔

[1] فہرست مخطوطات اردو قومی عجائب گھر کراچی۔ از ڈاکٹر ظفر اقبال: ص ۱۹۹۔

مقصد اول: در مجملی از احوال و اقوال میر سید احمد۔

مقصد دوم: درذکر اولاد و مریدان او

فصل سوم: درذکر سید الاولیا میر سید لطف اللہ معروف بہ شاہ لدھا بلگرامی، اس فصل میں بھی دو مقصد ہے۔

مقصد اول: درذکر احوال و بعضی کمالات شاہ لدھا۔

مقصد دوم: درذکر فرزندان و مریدان وی

فصل چہارم: در چندی از رقعات شاہ لدھا بہ مریدان و پیروان خود۔

اس فصل میں شاہ لدھا کے انسٹھ رقعات مختلف لوگوں کے نام درج کیے گئے ہیں۔

آزاد بلگرامی نے میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کے ترجمہ میں ان کا رسالہ گرامی نامہ نقل کیا ہے، جو اس کتاب کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ راقم السطور نے اس رسالے کو مع مختصر مقدمہ مجلہ قند پارسی، شمارہ ۸ نئی دہلی میں شایع کردیا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی مرحوم نے اپنے مضمون "علی گڑھ کے دو بلگرامی مخطوطات" مطبوعہ خدا بخش جرنل شمارہ ۶۹-۷۰، ص ۱۰۲-۱۱۴ علی گڑھ میں موجود انیس المحققین کے مخطوطے کا تعارف کراتے ہوئے بے خبر بلگرامی کے رسالے گرامی نامہ سے ایک اقتباس نقل کیا ہے اور اسے شاہ لدھا کے ایک مکتوب سے تعبیر کیا ہے درآنحالیکہ آزاد نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

"... از افادۂ ایشان (میر عظمت اللہ) رسالہ ماقل و دل و رسالہ غبار خاطر و گرامی نامہ در تصوف' در این جا گرامی نامہ نقل کردہ می آید"۔ انیس المحققین: ص ۸۲۰۷ (قلمی)

انیس المحققین کے قلمی نسخے کتابخانہ آصفیہ حیدرآباد، الہ آباد ادارہ کا میوزیم سنٹرل یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد اور مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ ذخیرۂ حبیب گنج میں موجود ہیں

وگ کی وضاحت

از ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ دہلی۔

جناب نور احمد شاہتاز کا مقالہ "وگ کی شرعی حیثیت" (معارف ستمبر ۱۹۹۶ء۔ ص ۱۸۷۔ ۱۹۶) نظر سے گزرا، دراصل اس پر تو کسی فقیہ ہی کو کچھ لکھنے کا حق ہے، تاہم ذیل میں چند معروضات پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ مقالہ نگار نے قوم بنی اسرائیل کو مصری قوم تصور کر لیا ہے جو درست نہیں، کہاں بھٹکتی پھرتی صحرا نورد قوم بنی اسرائیل اور کہاں متمدن و ترقی یافتہ مصری قوم، پھر من و سلوی کو چھوڑ کر زمین سے اگنے والی چیزوں کی طلب "ھل من مزید" پر دلالت نہیں کرتی۔

۲۔ لفظ باروکا بھی بظاہر صحیح (تائے مدورہ کے ساتھ) باروکۃ یا "بروکۃ" ہے الف کے ساتھ نہیں۔ اصل لفظ فرانسیسی میں PERRUQUE ہے اسی سے انگریزی میں PERUKE اور جرمن میں PERUECKE ہے اور انگریزی میں PERIWIG کا مختصر WIG ہو گیا ہے۔

۳۔ لفظ "لمتہ" و "جمۃ" کے معنی میں عربی لغات میں جو کچھ تحریر ہے اور وصل کی جو تفصیل حدیث میں آتی ہے وہ وگ یا باروکہ پر صادق نہیں آتی بلکہ اس وگ کا مناسب ترجمہ "شعر مستعار" ہے۔

۴۔ وصل (بالوں کو بالوں میں جوڑ کر لمبا کرنا) اور وگ میں بڑا فرق ہے کیونکہ وصل (بالوں میں بالوں کا ملانا) اس لیے ہوتا ہے کہ انسان کے قدرتی بال طویل یا بہت طویل معلوم ہوں اور وگ بالوں کی (انسانی بالوں نما) ٹوپی کا نام ہے جو از قسم زینت ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے موشے دایان کی وجہ سے فیشن کے طور پر بعض یہودیوں نے ایک آنکھ پر پٹی باندھنا شروع کر دیا تھا۔

وگ کا استعمال گنج کو چھپانے کے لیے بھی ہو سکتا ہے، لیکن زیادہ تر اس کا استعمال زینت و فیشن کے لیے ہے، نیز فیشن ہی کی ایک صورت یہ ہے کہ مختلف رنگوں کے بال دکھانے کے لیے مختلف رنگوں کے بالوں کی وگ استعمال کی جاتی ہے، اس سے تغییر فی خلق اللہ لازم نہیں آتی کیونکہ یہ انسانی جسم سے خارج ہے اور کسی طور پر بھی انسان کے جسم کا جز نہیں بن سکتی، بخلاف وصل کے۔ اس میں بالوں کو اس طرح جوڑا جاتا ہے کہ دیکھنے والا اسے قدرت کا ہی کرشمہ تصور کرتا ہے، البتہ وگ میں "زور" یعنی جھوٹ کا شائبہ ضرور ہو سکتا ہے کیونکہ جو لوگ اپنا گنج چھپانے کے لیے اسے استعمال کرتے ہیں یا وہ عورتیں جن کے بال چھوٹے ہیں یا وہ گنجی ہیں وہ اس عیب کو چھپانے کے لیے وگ استعمال کرتی ہیں، لیکن اس دھوکہ دہی کا اطلاق بھی صحیح معنی میں اسی وقت ہو گا جب کسی معاملے میں عیب کو مقابل کے صاحب معاملہ سے چھپایا جائے، سر راہ چلتے لوگوں کو اس سے کیا غرض کہ کسی کے بال حقیقت میں کالے ہیں یا سفید، یا گنج ہے یا نہیں، رہا عورتوں کا مسئلہ تو ان کے لیے تو عام مرد کے سامنے اپنی زینت کے اظہار کا کوئی جواز ہی نہیں۔

۵۔ مذکورہ وصل کے سلسلے میں مقالہ نگار نے علمائے مذاہب یا فقہائے امت کے اقوال کو نظر انداز کر دیا ہے تاکہ بقول ان کے قرآن و سنت سے دلیل طلب کرنے

والوں کا منھ بند کیا جاسکے۔ لیکن اس موضوع کی وضاحت کے لیے بہتر یہی تھا کہ ان اقوال کو بھی ذکر کیا جاتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مقالہ نگار نے فقہ کی جس واحد فقہی کتاب کا حوالہ دیا ہے اس میں جہاں اس مسئلہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اسے نظر انداز کر کے ایسی جگہ سے عبارت نقل کی ہے جہاں اس مسئلہ کا مختصراً اور ضمناً ذکر آگیا ہے جبکہ حوالہ مجلد اول ہی کا دیا ہے، جہاں تفصیل سے اس مسئلے کا ذکر آیا ہے، لیکن معارف (۱۹۱) میں پہلی عربی عبارت "الفقہ وادلتہ" کی مجلد خامس (ص ۵۶۸) سے منقول ہے نہ کہ مجلد اول سے جیسا کہ حوالہ دیا گیا ہے، راقم کو منقول عبارت کو تلاش کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ مقالہ میں مجلد خامس کا ذکر سرے سے ہے ہی نہیں۔

مقالہ نگار نے مذکورہ عبارت میں "وصل الشعر بشعر الآدمی" کا ترجمہ وگ کیا ہے جو درست نہیں، سہولت کے لیے یہاں مناسب ہوگا کہ اصل عبارت نقل کر دی جائے۔ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اپنی کتاب "الفقہ الاسلامی وادلتہ" (ج ۱، ص ۳۱۲-۳۱۴، بیروت، ۲، ۱۹۸۵ء) میں وصل اور متعلقات کی تفصیل بیان کی ہے، لیکن متن میں "لعن اللہ الواصلۃ والمستوصلۃ" والی حدیث بیان نہیں کی ہے، بلکہ وہ ضمناً مفہوم ہے، ان کی عبارت ملاحظہ ہو:

واللعنة على الشئ تدل على تحريمه، لان فاعل المباح لا تجوز لعنته، وعلى هذا فلا يجوز وصل شعر المرأة بشعر آخر

کسی چیز پر لعنت اس کے حرام ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ مباح کام کرنے والے پر لعنت جائز نہیں، اس لیے اس حدیث کی بنا پر عورت

لهذا الحديث، واما وصله بغير الشعر: فان كان بقدر ماتشد به راسها فلا بأس به، لان الحاجة داعية اليه، ولا يمكن التحرز منه، كذلك لا يحرم في الاصح مايزيد عن الحاجة ان كان فيه مصلحة من تحسين المرأة لزوجها من غير مضرة، وقال مالك: الوصل ممنوع بكل شئ سواء وصلته بشعر او صوف او خرق لحديث جابر: "ان النبي صلى الله عليه وسلم زجر ان تصل المرأة برأسها شيئا" (بالاشارة الى نيل الاوطار ۱ ص ۱۹۱)۔

کے بال کو دوسرے بالوں کے ساتھ جوڑا نہیں جاسکتا، بالوں کو بالوں کے علاوہ کسی دوسری چیز سے جوڑنے سے متعلق تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ چیز اس مقدار میں ہے کہ اس سے سر گوندھ لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ ضرورت میں داخل ہے اور اس سے بچا نہیں جاسکتا، اگر وہ ضرورت سے زیادہ ہے تب بھی اصح یہی ہے کہ اس کا جوڑنا بھی حرام نہیں، بشرطیکہ اس سے شوہر کے لیے اس کی بیوی کی زینت مقصود ہو اور اس میں کسی قسم کا ضرر بھی نہ ہو امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ بالوں کے ساتھ کسی بھی چیز کا جوڑنا ممنوع ہے، خواہ وہ چیز بال ہو یا اون یا دھجیاں۔ چونکہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ عورت

کسی چیز کو اپنے سر سے جوڑے۔ (باندھے)" (بحوالہ نیل الاوطار ج ۱، ص ۱۹۱)

وقد فصل الشافعية والحنابلة امر وصل الشعر فقالوا: ان وصلت المرأة شعرها بشعر آدمي، فهو حرام بلا خلاف سواء أكان شعر رجل ام امرأة، وسواء أكان شعر قريب محرم ام زوج ام غيرهما لعموم الادلة ولانه يحرم الانتفاع بشعر الآدمي و سائر اجزائه لكرامته بل يدفن شعره وظفره و سائر اجزائه۔

شوافع اور حنابلہ نے اس مسئلہ میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر عورت اپنے بال کسی انسانی بال سے جوڑے تو وہ بغیر کسی اختلاف کے حرام ہے، خواہ وہ بال کسی مرد کے ہوں یا عورت کے، کسی رشتہ دار محرم کے ہوں یا شوہر کے یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور کے، کیونکہ دلائل عام ہیں، اور اس لیے بھی کہ انسان کو حاصل شرف کی وجہ سے اس کے بال یا اس کے حصوں یا اجزاء سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا حرام ہے، بلکہ اس کے ناخن، بال اور تمام (جدا ہونے والے) اجزاء کو دفن کیا جائے گا۔

وان وصلته بشعر غير آدمي: فان كان شعراً نجساً، وهو عندهم شعر الميتة وشعر

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر انسانی بالوں سے عورت کے بالوں کو جوڑا جائے، اگر یہ غیر انسانی بال نجس ہیں

ما لا يوكل لحمه اذا انفصل في حياته، فهو حرام ايضا للحديث ولانه حمل نجاسة في صلاتها وغيرها عمداً، وهاتان الحالتان يستوي فيهما المرأة المزوجة وغيرها من النساء والرجال۔

اور وہ ان حضرات کے نزدیک مردار کے بال اور ان جانوروں کے بال ہیں جن کا گوشت کھانا جائز نہیں، جبکہ وہ ان کی زندگی میں کسی طرح علیحدہ ہو گئے ہوں۔ تو یہ صورت بھی (مذکورہ) حدیث کی وجہ سے حرام ہے اور اس لیے بھی کہ وہ نماز وغیرہ میں قصداً نجاست کی حامل ہونے کی مرتکب ہوئی، ان دونوں حالتوں میں شادی شدہ وغیر شادی شدہ عورت و مرد یکساں ہیں۔

واما الشعر الطاهر من غير الآدمي: فان لم يكن لها زوج فهو حرام ايضا، وان كان لها زوج يجوز لها في الاصح باذن الزوج والا فهو حرام (ج ۱، ص ۳۱۳ و ۳۱۴)

رہی تیسری صورت یعنی غیر انسانی پاک بال کی تو یہ صورت بھی اس عورت کے لیے حرام ہے جس کا شوہر نہیں، اگر اس کا شوہر موجود ہے تو اس صورت میں اصح قول کے مطابق شوہر اجازت دے تو جائز ورنہ حرام۔

مزید واضح انداز میں یہ مسئلہ فقہ السنۃ از السید سابق رحمہ اللہ (ج ۳ ص ۴۹۴) میں "النهی

عن ان تصل المرأۃ شعرھا بشعر غیرھا" کے عنوان کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

حقیقت میں جس موضوع پر مقالہ نگار نے بحث کی ہے وہ وصل (بالوں کو بالوں سے جوڑنے) کی شرعی حیثیت ہے نہ کہ وگ کی، اگر وصل کی حرمت اور وگ کی حرمت کی علت ایک ہے تو اس کی وضاحت کی جانی چاہیے تھی نہ یہ کہ دونوں کو ایک ہی قرار دیدیا جائے۔ یہاں یہ اور عرض کرتا چلوں کہ موسوعۃ فقہ ابراہیم النخعی (متوفی ۹۵ یا ۹۶ھ) ج ۲ ص ۳۳۰ میں اس بات کی وضاحت ہے کہ " لا باس ان تضع المرأۃ علی رأسھا الشعر بغیر وصل" یعنی عورت کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ بغیر جوڑا ہوا بال اپنے سر پر رکھ لے۔

یہ ہے صحیح وگ کی صورت، وگ اگر کسی حرام مادہ سے بنی ہو تو وگ کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، حلال مادہ سے بنی صورت میں صرف اسی وقت حرام ہوگی جبکہ وصل اور وگ میں کوئی علتِ تحریم مشترک ہو، مطلق وصل کی بنیاد پر حرام نہ ہوگی کیونکہ دونوں ایک چیز نہیں ہیں۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ احادیث مذکورہ میں تحریم عورتوں کے لیے ہے اور شرعی حکم میں عورت مرد کی تابع ہے مرد اس کا تابع نہیں۔ امید ہے کہ یہ وضاحت اس مسئلے کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔

مصادر

۱۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ/ الدکتور وھبۃ الزحیلی/ ج ۱-۸/ دار الفکر- دمشق (ط۲) ۱۹۸۵ء- ۲- فقہ السنۃ/ الشیخ السید سابق/ ج ۱-۳ (الطبعۃ الشرعیۃ) ۷/ بیروت ۱۹۸۵ء- ۳- موسوعۃ فقہ ابراھیم النخعی/ الدکتور محمد رواس قلعہ جی/ ج ۱-۲/ جامعۃ الملک عبد العزیز/ مکۃ المکرمۃ (ط۱) ۱۹۷۹ء-

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

علی گڑھ

۲۸-۱۲-۹۶ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

دسمبر ۱۹۹۶ء کے معارف میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم سے متعلق عبد اللطیف اعظمی صاحب کے مضمون میں بعض تسامحات جگہ پاگئے ہیں۔

۱۔ ضیاء صاحب نے ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے نہیں، بی اے کیا تھا- ایم- اے انہوں نے ۱۹۵۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے کیا اور ڈپلومیسی اور بین الاقوامی سیاسیات وہیں ان کے مضامین تھے۔

۲۔ جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عبد الغفار خاں چیر اور ذاکر حسین چیر قائم ہوئیں تو ضیاء صاحب کا تقرر ذاکر حسین چیر پر ہوا اور وہ دو سال اس پر فائز رہے۔ عبد الغفار خاں چیر پر محترمہ قرۃ العین حیدر کا تقرر ہوا تھا۔

۳۔ ضیاء صاحب نے انگریزی میں مولانا ابو الکلام آزاد کی جو سوانح لکھی ہے اور اس وقت زیر اشاعت ہے وہ مکمل نہیں ہے بلکہ پہلی جلد ہے جو مولانا کی ۱۹۴۰ء تک کی زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری جلد لکھنے سے قبل افسوس ہے کہ ضیاء صاحب کی وفات ہوگئی۔

نیازمند: ریاض الرحمن خاں شروانی

وفیات

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

دسمبر کے آخری عشرے میں اردو کے ایک بڑے عاشق و مجاہد، اچھے استاذ اور صاحب قلم ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی چل بسے۔ وہ ۱۹۱۶ء میں اودھ کے مشہور قصبہ سندیلہ کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولوی عنایت علی صدیقی بھی ذی علم شخص تھے۔

شجاعت صاحب کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا۔ ممتاز ڈگری کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کی تدریسی خدمات انجام دے کر سبکدوش ہوئے تو اپنے گھر پر اور اردو اکادمی میں طلبہ کو اردو پڑھاتے رہے۔

انھوں نے "حالی بحیثیت شاعر" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری لی، ان کا یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ کر مقبول ہو چکا ہے جو حالی پر مستند اور معیاری کام ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد ادبی تنقیدی اور تحقیقی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ اردو اور ہندی کی بعض نصابی کتابیں بھی ترتیب دیں۔ وہ اردو کی مختلف تنظیموں سے وابستہ تھے۔ انجمن ترقی اردو اور اتر پردیش انجمن اساتذۂ اردو کے سرگرم ممبر تھے۔ ادارۂ فروغ اردو سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے ماہانہ رسالہ فروغ اردو کے خاص نمبروں کی ترتیب و تدوین میں ان کا بھی حصہ تھا۔

مرحوم اودھ کی روایتی شرافت، وضع داری، تواضع اور اخلاق کا نمونہ اور بڑی پاکیزہ اور دلکش شخصیت کے حامل تھے، راقم کو ان سے دو ایک بار ہی ملنے کا اتفاق ہوا مگر انکے

خلوص، انکسار، شرافت اور شائستگی کا نقش اب تک دل میں بیٹھا ہوا ہے۔

اردو کے اس بحرانی دور میں اس کے ایسے مخلص اور سراپا عمل خدمت گزار کا اٹھ جانا بڑا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان خصوصاً چھوٹے بھائی شفاعت علی صدیقی صاحب کو صبر و شکیب عطا فرمائے۔ یہ سطریں تحریر کی جا چکی تھیں کہ شفاعت صاحب پر بھی شدید قلبی دورہ کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ انھیں صحتیاب کرے۔ آمین

ڈاکٹر وحید اختر

افسوس ہے مشہور شاعر و نقاد ڈاکٹر وحید اختر بھی وفات پا گئے، ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے فلسفہ میں ایم۔اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئے اور پروفیسر، صدر شعبۂ فلسفہ اور ڈین ہوئے۔

خواجہ میر درد پر بہت کم کام ہوا ہے، ان کی کتاب "خواجہ میر درد۔ تصوف اور شاعری" سے اس کمی کی تلافی ہو گئی جس کی علمی و ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ فلسفہ ادبی تنقید اور غالب وغیرہ پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قدر و قیمت کا حامل اور ان کے اچھے ادبی و تنقیدی ذوق کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر کے متعدد شعری مجموعے بھی شایع ہوئے ہیں، انھیں نظم و غزل دونوں پر قدرت تھی۔ ان کی شاعری مسائل عصر کی ترجمانی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کے ساتھ رحم و مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

"ض"

باب التقریظ والانتقاد

سید سلیمان ندوی۔حیات اورادبی کارنامے
پر ایک نظر

از جناب سبط محمد نقوی صاحب۔ اڈیٹر ہماری توحید لکھنؤ۔

یہ سید محمد ہاشم صاحب کا مقالہ تحقیق[1] ہے۔ جس کے لیے بقول محقق شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی نے ان کا انتخاب کیا تھا اور شعبہ کے لایق و فایق استاد ڈاکٹر نادر علی خاں صاحب کی نگرانی میں ۱۹۸۳ء میں یہ مقالہ مرتب و مکمل ہوا اور اسی سال یونیورسٹی نے اس پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

تقریباً بارہ سال یہ مقالہ منتظر اشاعت پڑا رہا پھر فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اترپردیش سرکار نے گرانقدر مالی امداد منظور فرما کے طباعت و اشاعت کی دشواریاں دور کیں اور ۱۹۹۵ء میں ڈمائی تقطیع پر فوٹو آفسٹ پر چھپ کے شایع ہوا۔

پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی نے جو اس مقالے کے ایک ممتحن بھی تھے۔ پیش لفظ لکھ کر کتاب کا بھاؤ بڑھا دیا ہے۔ پروفیسر صدیقی فرماتے ہیں :۔

"انہوں نے بہت گہرائی سے اس موضوع پر مطالعہ کیا ... اور کوشش کی ہے کہ روایات سے ہٹ کر تاریخ و تحقیق کی میزان پر اس کا تجزیہ کیا جائے .... حقیقت

[1] فاضل محقق اپنی تحقیق کے سلسلے میں دارالمصنفین بھی تشریف لائے مگر انہوں نے اپنا مقالہ تحقیق کسی وجہ سے یہاں نہیں بھیجا۔

یہ ہے کہ مصنف کے انکسار کے باوجود یہ کام بہت دقیع، لایق مطالعہ و توجہ اور قابل قدر ہے اور اردو کے ادبی سرمائے میں گرانقدر اضافہ ہے ..." (ص۱۱)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اس نقطۂ نظر سے صد درجہ لایق مطالعہ و توجہ ہے کہ ہماری دانش گاہوں میں تحقیق کا معیار کیا ہوگیا ہے۔ سپروائزر صاحبان، ممتحن حضرات اکاڈمیوں اور کمیٹیوں کے ممبر صاحبان کتنی لگن اور ذمہ داری سے تحقیق کا وادی پرخار طے فرماتے ہیں اور اردو کے ادبی و تحقیقی سرمائے میں جو اضافہ فرماتے ہیں وہ کس قدر فرومایہ اور گمراہ کن ہوتا ہے۔ اس کتاب میں فاضل محقق نے ابتدا بہ سکون کا کمال دکھایا ہے، یعنی "پس منظر" کے عنوان سے لکھے گئے پہلے باب سے ہی نہایت گمراہ کن اطلاعات کی فراہمی شروع کر دی ہے۔ بسم اللہ بہتوں کی غلط ہوتی ہے، لیکن یہاں کا عالم ہی دوسرا ہے۔

ہندوستان کی اسلامیات سے معمولی حس و مس رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور آپ کا دبستان دینیات یعنی فقہ و حدیث اور تفسیر کا ایک قدیم مرکز رہا ہے۔ یہ علوم اصطلاحی طور پر منقولات کہے جاتے ہیں۔ کم و بیش اسی خانوادہ بزرگ کا معاصر اودھ میں انصاریان سہالی کا ایک خانوادہ رہا ہے جو سربراہ خانوادہ ملا قطب الدین کے خون ناحق کے بعد لکھنؤ آکے پناہ گزیں ہوا اور "خانوادہ فرنگی محل" کے نام سے علمی تاریخ میں ممتاز ہوا اور ملا صاحب کی شناخت ملا قطب الدین شہید سے تاریخ نے معین کی۔ ع

گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی

[1] تذکیر و تانیث میں مقالہ نگار کے اپنے خاص مرجحات ہیں۔

یہ جملہ معترضہ غالباً یہاں بے محل نہ ٹھہرایا جائے کہ خود دلی میں بھی خانوادۂ خیرآباد، معقولات میں ممتاز مقام رکھتا تھا اور خانوادہ ولی اللٰہی کا متوازی مرکز درس تھا اور خانوادہ فرنگی محل سے مستفیض تھا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا فضل امام معاصر تھے۔ خانوادۂ خیرآباد کے بارے میں معتبر روایتیں ملتی ہیں کہ یہ منقولات میں خانوادہ ولی اللٰہی سے بھی شرف یاب تلمذ ہوا۔ لیکن خانوادۂ فرنگی محل کی نسبت ایسی کوئی روایت دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی کہ وہ ولی اللٰہی دبستان سے مستفیض ہوا ہو۔ یہ اس قلیل الاطلاع راقم کی بے علمی ہوسکتی ہے اور اس تذکرے میں تحقیقی صورت حال ابھر آنے کے تمام امکانات موجود ہیں۔ محقق گرامی البتہ استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی کی نسبت افادہ فرماتے ہیں:

"شاہ ولی اللہؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے قرآن کریم کے فارسی اور اردو ترجمہ، صحاح ستہ کی تعلیم، تبلیغ دین اور بعض علوم اسلامی کو اردو زبان میں منتقل کرکے اس سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان حضرات کی جدوجہد کے مراکز دہلی اور لکھنؤ تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اس شمع کی قندیلیں ملک کے ہر صوبے اور ہر علاقے پر ضوفشانی کرتی رہیں۔ ان حضرات کے تلامذہ میں سے ملا نظام الدین فرنگی محلی کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ عربی مدارس میں جو نصاب "درس نظامی" پڑھایا جاتا ہے وہ انہیں کے نام سے منسوب ہے ..." (ص ۱۲)

فاضل محقق نے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ ملا صاحب نے ان بزرگواروں سے کہاں استفادہ فرمایا! کیا زانوئے ادب تہہ کرنے کے لیے شد رحال کیا یا ان نامبردہ اساتذہ نے لکھنؤ قدم رنجہ فرمایا۔ یہ روایت تلمذ کہاں سے لی گئی، اس کا بھی اشارہ نہیں کیا گیا ہے!

خیر! اس سوال کو چھوڑیں، اس مبینہ شاگرد اور مذکورہ اساتذہ کی عمروں کا تفاوت ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ شاہ ولی اللہؒ کی ولادت سنہ ۱۱۱۴ھ میں ہوئی۔ استاذ الہند ملا نظام الدین کا سنہ ولادت سنہ ۱۰۸۹ھ ہے۔ یہ استاذ معظم شاگرد سے محض (چوبیس سال) صغیرالسن تھے۔

۲۔ شاہ رفیع الدینؒ: استاذ الہند کے یہ استاذ، شاگرد کی وفات کے بس دو برس بعد اس عالم کون و فساد میں وارد ہوئے۔ ملا صاحب کی وفات سنہ ۱۱۶۱ھ میں ہوئی۔ اور شاہ صاحب کی ولادت سنہ ۱۱۶۳ھ کا واقعہ ہے۔

۳۔ شاہ عبدالعزیزؒ: ملا صاحب کے یہ استاد سنہ ۱۱۵۹ھ میں متولد ہوئے اور ہاشم صاحب کے تراشے شاگرد سنہ ۱۱۶۱ھ میں چل بسے۔ یعنی ۶۹ سالہ علامۂ وقت نے دو برس کے بچے سے استفادۂ کمالات کیا۔

۴۔ سید احمد شہیدؒ کا سنہ تولد سنہ ۱۲۰۱ھ یعنی ملا نظام الدین کی وفات کے ۴۰ (چالیس) سال بعد۔

۵۔ شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ سنہ ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ملا صاحب اس کے ۳۴ (چونتیس) سال قبل جاں بحق تسلیم ہوچکے تھے۔

جہاں تک سید احمد شہید کا سوال ہے۔ آپ کے سوانح جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے دو جلدوں میں لکھے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تحقیق و سعادت مندی کا حق ادا کیا ہے۔ سید صاحب کے روحانی تصرفات اور کشف و کرامات کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن تحصیلی حالت سطحی بتائی ہے۔ سید صاحب ابجدی تعلیم میں ملا نظام الدین تو خیر، شاید کسی متنفس کے بھی استاد نہ ہوں! ہاں ارشاد و اصلاح کے فیضان سے

ایک دنیا مستفید ہوئی۔ آپ مرشد کی حیثیت سے نہیں" امام زمانہ" کی حیثیت سے اپنے متبعین و مقلدین میں پہچانے گئے" اور" امیر المومنین" کی لفظ[1] سے یاد کیے گئے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا آپ استاد الہند سے بہت متاخر تھے۔ اس لیے آپ کی طرف ملا صاحب کی نسبت تلمذ سراسر لاعلمی و غیر ذمہ دارانہ نگارش پر مبنی ہے اور کمال بے تحقیقی کا شاہکار ہے۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالۂ تحقیق سے مربوط متعلم و معلم حضرات دبستان ولی اللہی اور خانوادۂ فرنگی محل سے عارفانہ تو کیا واقفکارانہ تعلق بھی نہیں رکھتے یا اب ریسرچ کا کام اتنا لایعنی ہو گیا ہے کہ درست و نادرست کی پرکھ کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ ورنہ یہ سمجھنا کوئی بڑی دشوار بات نہیں ہے کہ یہ دونوں دبستان اگر مدمقابل نہ بھی رہے ہوں تو متوازی و متفرد ضرور تھے۔ فرنگی محل کی علمی روداد پیش کرتے ہوئے اسی خانوادے کے اس وقت فرد فرید پروفیسر ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ کے اودھ نمبر حصہ اول میں تحریر فرمایا ہے کہ:

" ملا نظام الدین کے عہد میں پہلی مرتبہ اسلامی مدارس کے لیے متفقہ درس ترتیب دینے کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے درس میں منقولات پر زیادہ زور دیا جبکہ نظام الدین نے اپنے ترتیب دادہ درس نظامی میں منقولات و معقولات دونوں پر یکساں زور دیا تھا۔ ملا نظام الدین کے ترتیب دادہ اس درس نے پورے ملک میں شرف قبولیت حاصل کیا اور آج تک زیادہ تر مدارس میں اسی کے مطابق تعلیم دی جا رہی ہے"۔ (ص ۱۴۱)

---

[1] مقالہ نگار کے تذکیر و تانیث کے اپنے ترجیحات ہیں۔

یہ اقتباس تو اس لیے پیش کیا گیا کہ ہاشم صاحب کے ثمرۂ تحقیق سے شاد کام ہونے والے طلبا و مبتدئین یہ بیان بھی پیش نظر رکھیں۔ لیکن جو بات ان کے پیش نظر رہنا چاہیے تھی وہ یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز نے استاذ الہند کے فرزند رشید عبد العلی کو "بحر العلوم" کے خطاب سے کن حالات میں مخاطب کیا۔ یہ بہت مشہور واقعہ ہے اور فرنگی محل کے وقایع نگاروں نے اسے عام طور سے بیان کیا ہے۔ یہ روداد بھی آپ پروفیسر ولی الحق انصاری کی ہی لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

" نواب ارکاٹ نے انہیں" ملک العلماء" کا خطاب عطا فرمایا۔" بحر العلوم" کا خطاب انہیں مشہور زمانہ بزرگ شاہ عبد العزیز سے عطا ہوا تھا اور اس کا قصہ یہ ہے کہ ملا حسن کے قیام دہلی کے دوران شاہ عبد العزیز کے ایک شاگرد ان سے بحث میں الجھ گئے، لیکن ملا حسن کے جوابوں سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ شاہ عبد العزیز صاحب کے پاس واپس ہو کر انہوں نے ملا حسن کے علم و فضل کی تعریف کی۔ جس کے جواب میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ معقولی حدیث و قرآن سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کسی نے اس گفتگو کی اطلاع ملا عبد العلی کو دی۔ جنہوں نے علم فقہ میں" ارکان اربعہ" لکھ کر شاہ صاحب کو روانہ کر دی، جسے پڑھ کر شاہ صاحب اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے خط میں ملا عبد العلی کو" بحر العلوم" کے خطاب سے یاد فرمایا اور اسی وقت سے یہ خطاب نام سے زیادہ مشہور ہو گیا"۔ (اودھ نمبر ص ۱۲)

ستمبر ۹۳ء کے معارف کے مضمون... مدرسہ اعظم کے مضمون نگار جناب کاوش بدری اس میں اضافہ فرماتے ہیں کہ:

" اگرچہ" ملک العلماء" کا خطاب ایک تخت نشین والی (نواب عمدۃ الامراء مدراسی) کا

عطا کرتا ہے اور "بحر العلوم" کا خطاب ایک بوریہ نشین "ولی" کا ارشاد ہے۔ لیکن جو مقبولیت ولی کے ارشاد کو ہوئی وہ والی کے خطاب کو نہ ہوئی"۔ (ص ۲۳)

لیکن جب موضوع سے مانوسیت ہی نہ ہو تو پھر آپ ان چیزوں کی توقع کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ اب ہم آگے بڑھیں۔

شبلی کی تاریخ ولادت

مولانا سید سلیمان سے متعلق مقالہ تحقیق میں ان کے معمار کی تاریخ ولادت کچھ ایسی اجنبی بات نہیں مگر قدرتی بات بھی نہیں۔ لیکن اس میں اگر کوئی بھید ہے تو شاید آگے کھلے۔ یہاں تو بس آپ ملاحظہ فرمائیں کہ ملک کے جہاد آزادی کی تاریخ سے ہمارے محقق کو کس درجہ بیگانگی ہے۔ انہوں نے مولانا کی تاریخ ولادت ۱۰ مئی بتائی ہے۔ (ص ۲۹۳) یہ تاریخ محقق خبیر کو کہاں سے ملی! یہ ماجرا ملاحظہ فرمائیے۔ حیات شبلی میں سید صاحب نے اپنے استاذ علامہ کی تاریخ ولادت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"مولانا شبلی مرحوم کی ولادت ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق مئی ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوتی جو عام طور سے غدر کے نام سے مشہور ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق کہ عین اس دن ولادت ہوئی جس دن ضلع اعظم گڑھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرک جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا..."

چونکہ اس معرکے کا آغاز میرٹھ میں ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا تھا اس لیے فاضل محقق نے یہ طے کر لیا کہ یہ لڑائی سارے کے سارے صوبے میں ایک ہی دن پھیل گئی اور اعظم گڑھ میں اسی دن اتنی منظم و طاقت ور ہو گئی کہ انقلابیوں نے سرکاری پہرہ چوکی کو دھتا بتا کے جیل کا پھاٹک توڑ دیا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے۔ ادھر توجہ

نہ فرمائی کہ اگر اسی دن کا واقعہ ہوتا تو سید صاحب خود ہی یہ تاریخ ذکر فرما دیتے۔ اس نشاندہی کی کیوں ضرورت پڑتی کہ عین اس دن... جس دن جیل کا پھاٹک توڑ ڈالا گیا تھا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ محقق مکرم بڑے سلیقے سے ناکامیوں سے کام لینے کے عادی ہیں، اس لیے غور و خوض کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ورنہ دوران تحقیق نہ سہی تعطل کی دس سالہ مدت میں تو صحیح تاریخ معلوم ہی کر سکتے تھے۔ جس طرح شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے مرحوم استاد ڈاکٹر محمد طاہر نے مدتوں پہلے تاریخ معین کی اور اسے ماہنامہ نیا دور لکھنؤ کے شمارہ بابت ماہ جون ۱۹۸۳ء میں چھپوایا اور پھر حال میں ڈاکٹر کاظم علی خاں استاد شعبۂ پوسٹ گریجویٹ کالج لکھنؤ نے تاریخ طے کی اور اسے انجمن ترقی اردو (ہند) کے شبلی سمی نار کے لیے لکھے گئے مقالے میں پیش کیا۔ اگر جنگ آزادی کی تاریخ کا جواب بہ کثرت و سہولت مہیا ہے تفحص ہاشم صاحب کرتے تو ڈاکٹر محمد طاہر مرحوم اور ڈاکٹر کاظم علی خاں سلمہ اللہ کی طرح گوہر مراد ان کے ہاتھ بھی لگتا۔ کیونکہ ان دونوں مراسلوں میں جتنے مآخذ مذکور ہوئے ہیں ان میں کم سے کم تین بہت قدیم ہیں۔ لیکن تلاش و تفحص کیسا انہوں نے تو پیش یا افتادہ قرائن کو پامال کیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہاشم صاحب نے قمری تاریخ و سنہ نقل نہیں کیا۔ جس کے ذکر میں سید صاحب سے فروگزاشت ہوگئی ہے۔ معلوم نہیں وہ کون سے حالات تھے تقویم صد سالہ کا مطالعہ سید جلیل کرنے سے قاصر رہے اور ذیقعدہ کا مہینہ لکھ دیا جب کہ فی الواقع رمضان و شوال کے مہینے مئی ۱۸۵۷ء سے مصادف تھے۔ ۳ جون ۱۸۵۷ء کو جس دن اعظم گڑھ میں جیل پر انقلابیوں کا کامیاب دھاوا ہوا اور اسی دن شبلی کی ولادت ہوئی۔ شوال ۱۲۷۳ھ کی نویں یا دسویں تاریخ تھی۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں نوکشوری یک صد و دو سالہ کے

حوالے سے نہم شوال سمجھتے ہیں۔

سادات حسینی ڈاکٹر سید محمد ہاشم نے مرحوم مولوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن دیسنوی اور غلام محمد صاحب کے تذکرۂ سلیمان کے حوالے سے بتایا ہے کہ "آپ کا ننہال زیدی اور ددھیال حسینی تھا"۔ لیکن سید صاحب کی قلمی بیاض سے مولوی نجم الہدیٰ نے جو مادری و پدری سلسلۂ نسب بیان کیا ہے اور جسے زیر نظر کتاب کے ص۱۳۱ پر نقل کیا گیا ہے اس کی رو سے تو ددھیال کا سلسلہ حضرت امام علی رضاؑ پر منتہی ہوتا ہے اس لیے معمولاً انہیں "رضوی" کہا جاتا ہے۔ ہرچند یہ حسینی، فاطمی، علوی بھی ہیں لیکن معمول یہی ہے کہ شجرے میں جو امامؑ پہلے آجائیں انہیں سے نسب کی نسبت دے دی جاتی ہے۔ ننہال بے شک "زیدی" ہے اور اسے عابدی اور حسینی بھی کہا جاتا ہے۔

رئیس وفد خلافت کسی تبصرے کے بغیر یہ عرض کرنا ہے کہ عام طور سے معلوم ہے کہ اس وفد کے راس و رئیس مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ سید صاحب مرحوم ایک معزز رکن تھے۔ لیکن فاضل محقق نے اس کا ذکر کئی طرح سے کیا ہے۔ ص۱۲۱ پر رقم طراز ہیں "وفد خلافت کے راس و رئیس" ص۱۱۱ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "اس وفد کے اراکین میں مولانا محمد علی جوہر (رئیس وفد) اور پھر ص۱۸۰ تک پہونچتے پہونچتے سید صاحب کو خلافت کا "رئیس وفد" بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ کتابیات میں "برید فرنگ" کا نام موجود ہے اور اس میں وہ تمام خط جمع کر دیئے گئے ہیں جو سید صاحب نے اس سفر کے دوران ہندوستان بھیجے تھے۔

آزادی کامل کا مطالبہ محقق کے رجحان طبیعت کو کیا کہا جائے۔ وہ سید سلیمان مرحوم کے لیے وہ سبھی اوصاف متحقق کر دینا چاہتے تھے جن کے خود مرحوم متمنی نہ تھے اسی سلسلے میں ہاشم صاحب سید صاحب کو

آزادی کامل کا نقیب بنا کے پیش کرنا نہیں بھولے۔ دنیا جانتی ہے کہ اس میدان کے اولین مسلم جانباز حسرت موہانی تھے۔ سید صاحب نے آزادی کامل کا جو مطالبہ پیش کیا، اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ سید صاحب حاصل سفر کے طور پر مرحوم مولانا عبدالباری کو تحریر فرماتے ہیں:

"... تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم کعبہ اور مرقد اخضر آزاد کرانا چاہتے ہیں تو ہم کو ہندوستان کو آزاد کرانا چاہیے، اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں سعی و کوشش صرف دنیاوی مسئلہ نہیں بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق ہے۔ اب علمائے کرام کو نہ صرف درس و افتاء کی خدمات انجام دینا چاہیے بلکہ ان کو صحیح راستہ سے مسلمانوں کو وہ سمجھانا چاہیے جس سے ان کا ملک ان کا ملک ہو، اب کانگریس اور مسلم لیگ صرف چند وکلا اور پیشہ ور اہل سیاست کی جولانگاہ نہ ہوگی بلکہ تمام مسلمان اپنے پورے (کذا) مذہبی اور دینی غیرت و حمیت کے ساتھ اس مقدس کام کے لیے آمادہ ہو جائیں گے اور اس وقت تک آرام نہ لیں گے جب تک وہ خود اپنے ملک میں آزاد نہ ہو جائیں گے ..." (ص ۲۰-۱۱۹)

کتاب میں برید فرنگ ص۱۷۰ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ درست نہیں ہے۔ ۲۶ اگست ۱۹۲۰ء کا یہ مکتوب مبارک ص۱۸۸ پر شروع ہوتا ہے اور اقتباس کا جو حصہ ہم نے پیش کیا ہے وہ برید فرنگ کے ص۱۹۰ پر ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ برید فرنگ کی فہرست میں شمار ۲۳ پر اسے "ہندوستان کی آزادی کا نعرہ" سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب بس یہ ہے کہ اس مجموعے میں اس خط کی حیثیت آزادی کے نعرے کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نکال لینا کہ سید صاحب نے کسی پلیٹ فارم سے آزادی کا نعرہ لگایا یا کوئی مطالبہ برسر عام پیش کیا، سراسر من مانی ہے۔ سید صاحب کو اپنی حیثیت کا پورا ادراک تھا وہ اپنے لیے چھینے جھپٹے فضائل

کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے کمال حق پوشی کے ساتھ حسرت کی خدمتوں کا اعتراف کیا۔ڈاکٹر خلیق انجم اپنی تصنیف "حسرت موہانی" میں ص۱۹۰ پر "نگار" کے حسرت نمبر سے سید صاحب کے مضمون کا اقتباس نقل کرتے ہیں:۔

"... آخر دسمبر ۱۹۲۱ء اصل (۱۹۲۰) میں گاندھی جی نے ہندوستان کے سوراج ملنے کی آخری تاریخ مقرر کی تھی۔احمد آباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا،محمد علی،شوکت علی،ابوالکلام نظر بند تھے۔باقی حضرات شریک تھے۔ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں میں بھی تھا،اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیامگاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا،حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے،گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لیے آئے تھے اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا "جلدی چلیے سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال (انڈی پنڈنس) کی تجویز پیش کردی ہے اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں ..." (ص۱۹۸)

آگے کی داستان اور لذیذ ہے لیکن یہ ناچیز تحریر پیش نظر مقالہ تحقیق کی بے اعتدالیوں اور تحقیقی خامیوں کی نیت سے سپرد قلم ہو رہی ہے۔اس میں حسرت موہانی کے فضائل نہیں بیان کرنا ہیں۔البتہ اتنا اور عرض خدمت کردوں کہ خلیق انجم نے یہ بھی بتایا ہے کہ ۱۹۱۵ء کے مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی میں اصلاحات کی اسکیم سے متعلق جناح مرحوم نے حسرت کی تجویز میں اصلاحات کو "لوکل سلف گورنمنٹ کی اسکیم والے نفاذ" سے بدلوانے کی ترمیم پیش کی تھی اور جناح صاحب کی اپیل پر اپنی ترمیم پر زور نہیں دیا تھا۔(ص۱۹۱)

اس گزارش سے محقق مکرم سمجھ لیں گے کہ اس کا زمانہ میں سید صاحب حسرت کے پیشوا نہ تھے۔ اور جناب سید صاحب کیا شاید کوئی بھی مسلمان نہ تھا۔

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال

از جناب اسرار عالم متوسط

تقطیع،بہترین کاغذ و کتابت و طباعت،مجلد مع گرد پوش،صفحات ۵۵۴،قیمت ۱۲۰/ روپے،پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز،بی ۳۵۔بیسمنٹ،حضرت نظام الدین ویسٹ،نئی دہلی۔۱۳۔

اس ضخیم کتاب کی وجہ تالیف یہ بتائی گئی ہے کہ موجودہ عہد میں دوسرے اقوام و ممالک کے مقابلے میں عالم اسلام کی اخلاقی حالت نہایت بدتر اور افسوسناک ہے،جس میں اصل دخل یہودی سازش اور فتنہ انگیزی کا ہے،جس کا دائرہ عمل اتنا موثر اور وسیع ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل اپنی قابل فخر اخلاقی تاریخ سے بالکل نابلد ہو گئی ہے،عموماً اخلاق اور اخلاقی صورت حال کے الفاظ سے ذہن معروف و متعارف معنی کی جانب ہی متوجہ ہوتا ہے،لیکن اس کتاب میں اخلاق کو تہذیب و ثقافت و تمدن اور ان کے متعدد پہلوؤں کے مرادف قرار دیا گیا ہے خیال تھا کہ اس لحاظ سے اس میں عالم اسلام کی تہذیبی و ثقافتی و تمدنی زوال کے اسباب کا جائزہ ہوگا،لیکن یہ کتاب عالم اسلام بلکہ عالم انسانیت کے خلاف یہودیوں کی مسلسل سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی تاریخ ہے قریباً سو صفحات یہودی اور عیسائی آویزش کے لیے وقف کیے گئے ہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جنگوں اور سازشوں کے ذریعہ جب یہود عالم اسلام کو تباہ و تاراج نہ کر سکے تو انہوں نے یورپ کی عیسائیت کے چہرہ اور روح کو مسخ اور مسخر کرکے عالم اسلام پر جو جدید حملے کیے

ان میں سیکولرائزیشن کا یہ سب سے موثر ثابت ہوا، قریب تین سو صفحات اسی سیکولرائزیشن
کے فلسفہ کی وضاحت و تشریح کی نذر کیے گئے ہیں، ان مباحث سے مصنف کے مطالعہ
کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن مضامین کے انبار کو جس انداز سے اس خرمن میں
یکجا کیا گیا ہے اس سے خوشہ چینی آسان نہیں ہے اور اس میں بڑا دخل کتاب کے اسلوب
و طرز نگارش کا بھی ہے، گنجلک اور گراں بار عبارتوں، نامانوس الفاظ و تراکیب نے بھی
سلاست و روانی کم کی ہے، مباحث کو سمیٹ کر نہ لکھنے کی وجہ سے جابجا تکرار ہو گئی
ہے، افکار کی کثرت و گوناگونی نے اکثر مباحث کو پابند حدود نہیں رہنے دیا۔ مثلاً
یہودی سیکولرائزیشن میں ہی ہندو یا بھارتی سیکولرائزیشن کی بحث شروع ہو گئی اور جب
اختتام کو پہونچی تو پھر سیکولرائزیشن کی تعریف اور اس نظریہ کی توجیہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔
ایک جگہ مسلمانوں کی تاریخ عروج و زوال کے متعلق اسلامی تاریخ نگاری کی اب تک کی
تمام کوششوں کو جس طرح مغربی اور یہودی فکر قرار دیا گیا ہے وہ فکر کی ژولیدگی اور
پراگندہ خیالی کا عجب نمونہ ہے، فاضل مصنف نے اپنے نتائج فکر کو ایسا لگتا ہے کے
ذریعہ پیش کر کے ان کے حتمی اور قطعی ہونے کا بھی انداز اختیار کیا ہے۔ ایک حدیث شریف
میں امت مسلمہ کو یہود و نصاریٰ کے تتبع سے خبردار کیا گیا، اس کے ضمن میں مصنف کو
یہودی کو خواہ وہ فرمودۂ قرآنی کے مطابق مسلمانوں کے کیسے ہی شدید دشمن کیوں نہ
ہوں موضوع بنانا اور نصاریٰ سے یکسر صرف نظر کرنا قرین انصاف نہیں تھا، عربی عبارتوں
خصوصاً قرآنی آیتوں کے بعض ترجموں میں بے احتیاطی کی گئی ہے۔ انگریزی تعبیرات بھی
گنجلک اور مبہم ہیں مثلاً دو بالکل مختلف معاشرتی عمل ہوتے ہیں، تجویز نہ اور برگزیدہ،
ماقبل ماڈرن سوسائٹیاں وغیرہ بعض عربی اور فارسی عبارتوں اور اشعار کا ترجمہ یا

خلاصہ ضروری تھا، لیکن ان خامیوں سے کتاب کی قدر و قیمت پر حرف نہیں آتا، مصنف
کا جذبہ قابل قدر ہے، یہ عالم اسلام سے یہودیوں کی نفرت و عناد کے موضوع پر
ایک مفید اور پُر از معلومات کتاب ہے جو مصنف کی محنت و مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

امثال القرآن

از جناب مولوی محمد ثناء اللہ عمری ایم، اے،
متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۲۳۴، قیمت درج نہیں،
پتہ: ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ دارالسلام عمرآباد، این اے ڈسٹرکٹ،
تامل ناڈو، ۶۳۵۸۰۸۔

قرآن مجید کے اسلوب و پیرایۂ بیان کی بے شمار خوبیوں اور امتیازات میں ایک
دلکش انداز اس کا طرز خطاب بھی ہے، اس نے اپنے حقایق و معارف کی وضاحت و
تشریح کے لیے ضرب الامثال اور تمثیل کا موثر اور دلنشین پیرایہ بھی اختیار کیا ہے،
اس کے ذریعہ دقیق معارف و حکم بھی مخاطب کے لیے آسان اور قابل فہم ہو جاتے
ہیں، ان قرآنی ضرب الامثال کو زیر نظر کتاب میں مختلف عنوانوں کے تحت یکجا کر دیا
گیا ہے مثلاً اہل شرک، اعمال شرک، اہل نفاق، رسالت کی ضرورت، شمع رسالت،
انفاق فی سبیل اللہ، سود خور و چغل خور، نقض عہد، کلمہ طیبہ کلمہ خبیثہ، نور و ظلمت، ہدایت و
ضلالت، حق و باطل وغیرہ، ہر آیت کی تمہید کے بعد اسکا ترجمہ و تشریح ہے جس میں مختلف
مفسرین کے اقوال و آراء سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، شروع میں فلسفہ امثال پر ایک عمدہ
بحث کی گئی ہے، فاضل مصنف بڑے زود نویس ہیں، ان کے طرز نگارش پر اسلوب ماجدی
کا خاص اثر ہے، قرآنی خدمت میں بھی شاید یہی جلوہ نمایاں ہے جس پر پہلے بھی ان کی کتابیں
شایع ہو چکی ہیں، زیر نظر کتاب کو اپنے موضوع پر اردو میں غالباً پہلی مرتب و مبسوط کاوش ہونے

کیا ہم مسلمان ہیں: از جناب شمس نوید عثمانی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۸۵، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی نمبر ۶۔

تجلی مرحوم (دیوبند) کا یہ خاص اور مقبول عنوان تھا جسے جناب شمس نوید مرحوم پابندی سے لکھا کرتے تھے، یہ سلسلہ اس زمانے میں اتنا پسند کیا جاتا تھا کہ دوسرے رسالے بھی اسے نقل کرتے تھے، اس میں حضور اکرمؐ اور حضرات صحابہ کرامؓ کی سیرت و سوانح کے پاکیزہ واقعات کو وہ ایسے دل نشیں اور موثر انداز میں پیش کرتے کہ قلب و ذہن پر ایک خاص کیف و اثر طاری ہو جاتا، تجلی و صاحب تجلی کے بعد شمس نوید صاحب بھی مرحوم ہو گئے، اب مرکزی مکتبہ اسلامی نے عام فائدے کے لیے اس سلسلۂ مضامین کو نہایت اہتمام سے یکجا کر کے شائع کر دیا، پیش لفظ مدیر تجلی مولانا عامر عثمانی مرحوم کے قلم سے ہے۔

عکس در عکس: از جناب محمد یعقوب اسلم، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۴، قیمت ۷۰ روپے، پتہ: ٹمل ناڈو پبلی کیشنز ۲۶- امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماؤنٹ روڈ، مدراس ۲۔

تامل ناڈو کے جناب علیم صبا نویدی جنوبی ہند بلکہ اب پوری اردو دنیا میں ایک کامیاب شاعر و نثر نگار کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں، افسانہ نگاری اور وادی تحقیق کی بھی انہوں نے سیر کی ہے، لیکن ان کے نقاد ان کی حمد و نعت گوئی کے زیادہ مداح و قائل ہیں، اور اس میں انکی خاندانی نسبت و ماحول کی برکات و حسنات کا بھی دخل ہے اور اس کا اثر خود ان کی شخصیت میں نمایاں ہے، اس کتاب میں ان کے سوانح بھی بڑے دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضامین اور کتابوں کا مفصل ذکر بھی آگیا ہے۔

ع۔ص۔